جب ہم ساتویں جماعت میں فسٹ میں ڈویژن پاس ہوئے تو صاحب بس پوچھو مت۔ دُنیا بھر کی خوشیاں ہمارے گھر میں سمٹ آئیں۔ ابا جان اپنی گھنی مونچھوں میں ہونٹوں پر پھیلتی ہوئی مسکراہٹ چھپانے کی لاکھ کوشش کرتے مگر موتیوں جیسے صاف اور چمک دار دانت تھے کہ نکلے پڑتے تھے۔ امی جان کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ ایک تو تھیں ہی سرخ سفید کہ ہاتھ لگائے میلی ہوں۔ اس پر خوشی کی لالی۔ بس چہرے پر شفق پھوٹی پڑی تھی۔

ہم سب دالان میں بیٹھے تھے۔ امی، ابا، ہم اور ہماری خالہ زاد بہن سیما۔ شرارت میں ہم سیر تو وہ خیر سے سوا سیر۔ بوا کریمن نے چلم بھر کر حقے پر رکھ دی۔ ابا جان نے پہلا کش ہی لگایا تھا کہ امی ہاتھ سے ناک دبا کر بولیں۔ ''توبہ! ناک سڑا دی تم نے تو۔ یہ موا حقہ کبھی پیچھا بھی چھوڑے گا؟ ہر وقت گڑ گڑ گڑ گڑ۔ دن بھر کھوں کھوں کھوں۔ بڑوں ہی کی دیکھا دیکھی بچے بُری عادتیں سیکھتے ہیں۔ میرا بس چلے تو ان موئے حقوں کا حقہ پانی بند کر دوں..... ہاں تو..... میں کہہ رہی تھی کہ بیٹا، خیر سے، امتحان میں پاس ہوا ہے اور نہ کوئی مٹھائی نہ خوشی۔ دُنیا سنے گی تو کیا کہے گی؟''

ابا جان بولے۔ ''آج کوئی نرالا تھوڑی پاس ہوا ہے۔ پہلے بھی تو پاس ہی ہوتا رہا ہے، ماشاء اللہ۔''

امی ہاتھ ہلا کر بولیں۔ ''پاس تو ہوتا رہا ہے مگر پھٹ ڈیزن کبھی پاس نہیں ہوا.....''

پھٹ ڈیزن سن کر ہماری تو ہنسی نکل گئی، سیما نے منہ میں دوپٹا ٹھونس لیا اور ابا جان مسکرا کر بولے۔ ''پھٹ ڈیزن نہیں، خدا کی بندی، فسٹ ڈویژن۔''

امی بولیں۔ ''اے وہ پھٹ ہو کہ فٹ۔ میں نے کون سا مڈل پاس کیا ہے۔ مجھے کیا پتا موا پھٹ ہوتا ہے کہ فٹ۔''

ابا جان بولے۔ ''مڈل پاس کیا ہوتا تو آج یہ بچے کاہے کو ہنستے؟ آج ہی انگریزی کی پہلی کتاب منگا لو۔ سعید سے دو حرف روز پڑھ لیا کرنا۔''

امی ہنس کر بولیں۔ ''اے خاک ڈالو۔ اب بڑھاپے میں گٹ پٹ کرنے بیٹھوں گی۔ ہاں تو، میں کہہ رہی تھی کہ خدا نے یہ خوشی کا موقع دیا ہے۔ کوئی چھوٹی موٹی دعوت کر ہی ڈالو۔ اسی بہانے چار پیارے عزیز اکٹھے ہو جائیں گے۔''

ابا جان بولے۔ ''اچھا بھئی، اچھا۔ کل شام سب کو بلا لو۔ کھانے کے بعد قوالی بھی ہو گی۔ جھنڈے خاں، منڈے خاں قوالوں کو بلا

لیں گے۔''

ہم تالیاں بجا کر بولے۔''آہاہاہا'' سیما خوشی سے ناچنے لگی۔

امی بولیں۔''تو میں کریمن کے ہاتھ سب کو بلاوا بھیجے دیتی ہوں۔''

برسات کے دن تھے مگر آسمان بالکل صاف تھا۔ کمرے چھوٹے چھوٹے سے تھے، اس لیے صحن میں شامیانہ لگا دیا گیا تھا۔ کھانے کے بعد تمام لوگ قرینے سے بیٹھ گئے تو جھنڈے خاں، منڈے خاں نے ہارمونیم اور طبلے نکالے۔ ہمیں کہیں اور جگہ نہ ملی تو ہم نے کونے میں نارنگی کے پیڑ تلے ڈیرا لگا دیا۔ ہمارا لنگوٹیا یار سرمد بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس جگہ بالکل اندھیرا تھا۔ ہم تو سب کو دیکھ سکتے تھے مگر ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہاں سے قوالوں تک کا فاصلہ مشکل سے آٹھ دس گز ہوگا۔

ایک تو جھنڈے خاں، منڈے خاں کی صورت ہی منحوس تھی، دوسرے انہوں نے جو گانا شروع کیا، وہ فارسی کا تھا۔ ہمارے خاک بھی پلے نہ پڑا۔ پھر مصیبت یہ کہ ایک ایک شعر کو دس دس بار کہتے۔ شور زیادہ مچاتے اور گاتے کم۔

ان میں ایک بڈھا طبلچی بھی تھا۔ اس نے اتنی زور سے طبلے پر ہاتھ مارا کہ ہم اُچھل پڑے۔ جھنڈے خاں کانوں پر ہاتھ رکھ کر زور سے چیخے۔''اجی لشتم کے پشتم۔''

منڈے خان جھوم کر دہاڑے۔''اجی واہ وا۔''

جھنڈے خان پھر زور سے ڈکرائے۔''اجی لشتم کے پشتم۔''

اور تمام قوال کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولے۔''اجی واہ وا۔''

غرض آدھ گھنٹے تک وہ یہی لشتم پشتم کرتے رہے۔ ہم تنگ آ کر بولے۔''یار سرمد، یہ تو سخت نامعقول قوال ہیں۔''

سرمد منہ چلاتے ہوئے بولا۔''میرا بس چلے تو ان کے حلق میں کپڑا ٹھونس دوں۔''

ہم نے پوچھا۔''یہ تو کیا کھا رہا ہے؟''

بولا۔''الائچی دانے۔'' اور یہ کہہ کر اس نے تھوڑے سے ہمیں بھی دے دیئے۔ چھوٹے چھوٹے سے تھے۔ گول گول۔

یکا یک ہمیں شرارت سوجھی۔ بڑی انوکھی اور دل چسپ۔ دل مارے خوشی کے دھک دھک کرنے لگا۔ ہم نے ایک الائچی دانہ انگلی کے ناخون پر رکھا اور اسے انگوٹھے سے دبا لیا۔ جوں ہی ایک قوال نے آ آ آ آ کر کے منہ پھاڑا..... ہم نے الائچی دانہ پوری قوت سے اس کی طرف پھینکا۔ الائچی دانہ انگلیوں میں سے ایسے نکلا جیسے کمان سے تیر اور سیدھا اس قوال کے حلق میں گھس گیا۔ وہ خپ خپ خپ کرتا ہوا گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ جھنڈے خاں نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر آنکھیں میچ کر، حلق پھاڑ کر زور سے تان اُڑائی۔

''آ آ آ آ آ۔''

ہم نے دوسرا الائچی دانہ انگلی پر رکھا اور جب جھنڈے خاں نے آ آ آ آ آ کرتے ہوئے ہماری طرف منہ کیا تو ہم نے ایک دم انگلی چھوڑ دی۔ نشانے کے ہم پکے تھے۔ الائچی دانہ سن سے انگلیوں میں سے نکلا اور جھنڈے خاں کے منہ میں گھس گیا۔ وہ بھی خپ خپ خپ کرنے لگے۔

انہیں دیکھ کر طبلے والے بڈھے نے گلا صاف کیا اور لگا منہ پھاڑنے۔ ہم نے تیسرا الائچی دانہ انگلی پر رکھا اور انگوٹھے سے دبا کر اسے چھوڑنا چاہتے ہی تھے کہ ایک دم پیچھے سے کسی نے ہاتھ پکڑ لیا۔ پلٹ کر دیکھا تو سیما تھی۔

''س س سیما..... ت ت تم!'' ہماری زبان لڑکھڑا گئی اور خون رگوں میں دوڑتے دوڑتے ایک دم رُک گیا۔

آہستہ سے بولی۔''ذرا ادھر تشریف لائیے۔ اُٹھیے، جلدی کیجئے۔''

وہ آگے آگے اور ہم پیچھے پیچھے۔ صحن پار کر کے کمرے میں پہنچے تو دھیرے سے بولی۔''تو یہ آپ تھے۔ کیوں؟ اگر میں خالو جان سے کہہ دوں تو؟''

ہم گھبرا کر بولے۔''تو سیما بہن یہ جو چند بال تمہیں میری کھوپڑی پر نظر آ رہے ہیں، انہیں ابا جان کا جوتا اس طرح دھن کر رکھ دے گا جس طرح خیر دین دھنیے نے دادی اماں کے پرانے لحاف کی روئی دھن کر رکھ دی تھی۔ تمہیں یاد ہے، سیما ب ب بہن؟''

سیما مسکرا کر بولی۔''ہاں، یاد ہے مگر بہت دنوں کے بعد آج بدلہ لینے کا موقع ملا ہے۔ گن گن کے بدلے لوں گی۔''

ہم آنکھوں میں آنسو بھر کے بولے۔''سیما بہن، معاف کر دو۔ خدا آپ کو معاف کر دے گا۔ اللہ میاں نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی کا ایک عیب چھپاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ستر عیب چھپاتا ہے۔''

سیما بولی۔''ہم تمہاری طرح چغل خور نہیں۔ ہم تمہیں معاف کرتے ہیں مگر ایک شرط پر..... وعدہ کرو ہمیں روز املیاں لا کر دیا کرو گے۔ خوب کھٹی کھٹی۔''

ہم نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں سیما بہن۔ روز آپ کو املیاں لا کر دیا کروں گا۔ آپ کے حساب کے سوال بھی کر دیا کروں گا۔ عید بقرعید پر پیسے ملیں گے تو وہ بھی آپ کو دے دیا کروں گا اور سیما بہن..... جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو راوی کے کنارے آپ کے لیے ایک شان دار محل بنواؤں گا اور اس میں کھٹی املیوں کا ایک عالی شان باغ لگواؤں گا۔ ہر درخت کے نیچے آم کے اچار کے مٹکے رکھے ہوں گے۔''

سیما کے منہ میں پانی بھر آیا اور وہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔

ہم بولے۔ ''تو اب میں جاؤں سیما بہن، پیاری بہن، ننھی بہن؟''

سیما بولی۔ ''ذرا ٹھہریے۔ تھوڑی سی سزا آپ کو ملنی ہی چاہیے۔ بس ذرا سی۔''

یہ کہہ کر اس نے سیدھا ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھا، سیدھے ہاتھ کی کہنی تلے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی رکھی اور اس طرح جھومی جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ پھر ایک دم ڈانٹ کر بولی۔ ''کان پکڑو.....!''

ہم نے جھٹ کان پکڑ لیے۔ کیا کرتے۔

وہ بولی۔ ''مرغا بنو.....!''

ہم فوراً مرغا بن گئے۔

سیما بولی۔ ''ناک سے زمین پر لکیر کھینچو، لمبی سی۔''

ہم ایک دم سجدے میں گر پڑے اور ناک سے ایک گز لمبی لکیر زمین پر کھینچ دی۔

سیما نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ بس اب جاؤ۔''

کیسی قوالی اور کہاں کا گانا۔ جلدی سے کمرے میں گھسے اور چٹخنی لگا کر سو گئے۔

صبح اتوار تھی۔ خوب گھوڑے بیچ کر سوئے۔ آنکھ کھلی تو دھوپ پھیل چکی تھی۔ دو تین انگڑائیاں لیں، سلیپر پہنے اور غسل خانے کی طرف چلے۔ راستے میں ابا جان کا کمرا تھا۔ جب ہم کمرے کے پاس سے گزرے تو اندر سے آواز آئی۔ ''سعید صاحب.....!''

ایسا معلوم ہوا جیسے زمین نے پیر پکڑ لیے ہوں۔ قدم نہ آگے اُٹھتے تھے نہ پیچھے۔ اتنے میں پھر آواز آئی۔ ''سعید صاحب! سنا نہیں آپ نے؟''

ہم نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بڑی مشکل سے اٹک اٹک کر بولے۔ ''اب اب اب ابا جان، آپ نے مجھے بلایا؟''

آواز آئی۔ ''جی ہاں، میں نے ہی آپ کو بلایا ہے۔ ذرا اندر تشریف لائیے۔''

ڈرتے ڈرتے، لرزتے، کانپتے اندر گئے۔ ابا جان کے چہرے کے سامنے اخبار تھا۔ انہوں نے اخبار کا ورق اُلٹا اور بولے۔ ''یہ رات آپ نے کیا حرکت کی تھی، میاں صاحب زادے؟''

ہمارا یہ حال کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ سوچتے تھے کہ زمین پھٹ جائے اور اس میں سما جائیں۔ چپ چاپ سر جھکائے کھڑے رہے۔

ابا جان نے اخبار میز پر رکھ دیا اور عینک ماتھے پر کر کے بولے۔ ''بیٹا! تم نے سمجھا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو وہ مذاق ہے، مگر ناسمجھی میں تم یہ نہ سمجھ سکے کہ بعض مذاق بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ فرض کرو، تمہارا الائچی دانہ منہ میں جانے کے بجائے قوال کی آنکھ میں لگ جاتا تو اس کی آنکھ پھوٹ جاتی۔ تمہارا تو مذاق ہو جاتا اور اس غریب کو ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھ سے ہاتھ دھونا پڑتے۔''

اتنا کہہ کر وہ آگے کو جھکے اور ایک ایک لفظ تول تول کر بولے۔ ''بیٹا، جو بچہ شرارت نہ کرے تو وہ بچہ نہیں ہوتا، فرشتہ یا ولی اللہ ہوتا ہے، مگر..... ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ ایسی شرارت جس سے دوسروں کو نقصان پہنچے یا ان کا دل دکھے شرارت نہیں، شیطانی ہے اور شیطانی کرنا شیطان کا کام ہے، انسان کا نہیں.....''

ہم شرمندہ ہو کر بولے۔ ''ابا جان، اصل میں شیطان نے مجھے بہکا دیا تھا۔''

ابا جان بولے۔ ''ہاں ہاں، ہم بھی یہی سمجھے تھے۔ بھلا یہ کبھی ہو سکتا ہے کہ تم جیسا سمجھ دار اور عقل مند بچہ ایسی ناسمجھی کی باتیں کرے۔ ہمیں اُمید ہے کہ آئندہ تم ایسی بُری حرکت نہیں کرو گے۔''

ہم جلدی سے بولے۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں، ابا جان۔''

خوش ہو کر بولے۔ ''شاباش! جیتے رہو۔ اب جاؤ، جا کر نہاؤ، ناشتا کرو۔ پھر ہمارے پاس آنا۔ کیرم کھیلیں گے۔ سیما کو بھی لیتے آنا۔''

ہم منہ لٹکائے باہر نکلے۔ دالان میں سیما دوپٹا منہ میں ٹھونسے کھڑی ہنس رہی تھی۔ ہمارے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ مٹھیاں بھینچ کر اور دانت پیس کر آگے بڑھے تو بولی۔ ''خالو جان! دیکھیے دیکھیے.....!''

☆☆☆

Sharjeel Ahmed

سانپ کی چھتری

برسات کا مہینا تھا۔ آسمان پر بادل گھرے ہُوئے تھے، کالے کالے، گہرے گہرے۔ سونیا اور مونی برآمدے میں بیٹھے کھیل رہے تھے۔ امّی، باورچی خانے میں، پُوریاں تل رہی تھیں۔ آپی آلُو چنے کی بھاجی بنا رہی تھیں۔

سونیا اور مونی کھیلتے کھیلتے تھک گئے تو سوچنے لگے، اب کیا کریں؟ ایکا ایکی سونیا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اُسے ایک نیا خیال سُوجھا تھا۔ اُس نے مونی سے کہا "مونی بھیّا، وہ جو سامنے شیخ صاحب کا باغ ہے نا، اُس میں کھُمبیاں اُگ آئی ہیں۔ کل میں نے دیکھی تھیں۔"

مونی نے پوچھا "کھُمبی کیا ہوتا ہے؟"

"ہوتا نہیں، ہوتی ہے" سونیا بولی "تم نے کبھی سانپ کی چھتری نہیں دیکھی؟ برسات میں اُگتی ہے۔"

"ارے واہ!" مونی نے کہا "سانپ کی چھتریاں تو میں نے بہت دیکھی ہیں۔ لیکن اُنہیں کیا ہُوا؟"

"ہُوا تو کچھ نہیں" سونیا بولی "چلو، توڑ کر لائیں۔ اُن کی بھاجی بڑی مزے دار ہوتی ہے۔ پُوریوں کے ساتھ کھائیں گے۔"

مونی جھٹ پٹ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ سونیا آسمان کی طرف دیکھ کر بولی "کہیں مینہ نہ پڑنے لگے۔ اپنی چھتری لے لو۔"

مونی نے کہا "واہ! چھتریاں تو باغ میں ڈھیروں مل جائیں گی۔ ہاتھ لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔؟"

"تم بھی نرے بُدّھو کے بُدّھو رہے" سونیا بولی "ارے میرے بھولے بھیّا! وہ تو بہت ننھی مُنّی ہوتی ہیں۔ وہ ہمیں بارش سے کیا بچائیں گی۔ تم اپنی چھتری لے لو، میں اپنی ٹوکری لے لیتی ہُوں۔"

مونی کمرے میں سے چھتری لے آیا اور سونیا نے ٹوکری اُٹھالی۔ دونوں بہن بھائی باغ میں پہنچے اور سانپ کی چھتریاں اُکھیڑ اُکھیڑ کر ٹوکری میں ڈالنے لگے۔

اچانک بجلی چمکی۔ پھر زور سے بادل گرجا، گڑگڑ گڑگڑ، اور ایک دَم رِم جِھم رِم جِھم برکھا برسنے لگی۔ مونی نے ٹوکری اُٹھائی، سونیا نے چھتری لگائی، اور بھاگے گھر کی طرف، سرپٹ۔

راستے میں ایک درخت تھا۔ اُس کی شاخیں جُھکی ہُوئی تھیں۔ مونی اور سونیا درخت کے نیچے سے گزرے تو چھتری درخت کی شاخوں میں اُلجھ گئی اور اُس میں جگہ جگہ سُوراخ ہو گئے۔

"ہائے اللہ!" سونیا نے کہا "سوراخوں میں سے پانی آرہا ہے۔ ہم تو بھیگ جائیں گے۔"

"مجھے بھوک لگ رہی ہے" مونی بولا "اگر ہم دیر سے پہنچے تو امّی اور آپی ساری پُوریاں کھا جائیں گی۔ ہم کیا کھائیں گے؟"

سونیا جل کر بولی "تمہیں پُوریوں کی پڑی ہے، اور مجھے کپڑوں کی فکر ہے۔ یہاں آس پاس کوئی ایسی چیز بھی تو نہیں جس کے نیچے کھڑے ہو جائیں۔"

مونی مُنہ لٹکا کر بولا "یہ سانپ کی چھتریاں بھی ہمارے کام نہیں آسکتیں۔ اِن کے نیچے تو ایک جھینگر ہی بیٹھ سکتا ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے سر کھُجایا، پھر چٹکی بجا کر بولا "آئیڈیا! میرے دماغ میں ایک ترکیب آئی ہے۔"

اُس نے سونیا سے چھتری لی، اور اُس کے سُوراخوں میں سانپ کی چھتریاں لگا دیں۔ اب جو سونیا نے چھتری لگائی تو ایک بُوند بھی اُن کے کپڑوں پر نہیں پڑی۔ سانپ کی چھتریوں نے چھتری کے سُوراخ بند کر دیے تھے۔

"کبھی کبھی تو تُم بھی عقل کی بات کر جاتے ہو" سونیا نے ہنس کر کہا "میں تو تُمہیں نرا بدّھو ہی سمجھتی تھی۔"

دونوں بہن بھائی گھر آئے تو پُوریاں تیار ہو چکی تھیں۔ ابّو جان بھی آ گئے تھے۔ امّی نے بچّوں کو دیکھا تو بولیں "ارے بھئی، کہاں چلے گئے تھے تم لوگ؟ پُوریاں ٹھنڈی ہو رہی ہیں۔"

سونیا بولی "ہم کھُمبیاں لینے گئے تھے۔ بس اب انہیں جھٹ پٹ پکالیں۔ پُوریوں کے ساتھ کھائیں گے۔"

امّی نے کہا "ابھی تو چُولھے کے پاس سے اُٹھ کر آئی ہُوں۔ کل پکاؤں گی۔ باورچی خانے میں رکھ آؤ۔"

"نہیں امّی" سونیا بولی "ابھی پکایئے۔ اِتنی مُصیبت سے تو توڑ کر لائے ہیں۔"

امّی نے ہنس کر کہا "یہ تم پھُٹ پھُٹ کیوں کر رہے ہو؟"

مونی بولا "مجھے سرسر سردی لگ رہی ہے۔ بارش میں بھیگ گیا ہوں۔"

ابّو نے مُسکرا کر کہا "چلیے، بچوں کی بات مان لیجیے۔ لیکن بھئی، پہلے تم دونوں جا کر کپڑے بدل لو۔" (سعید لخت)

Sharjeel Ahmed

جاپانی لوک کہانی

جوانی کا چشمہ

سعید لخت

اُس ملک میں جسے ہم جاپان اور جاپانی نِپن کہتے ہیں، کسی زمانے ایک بوڑھا لکڑہارا، یوشیدا، اپنی بیوی، فومی، کے ساتھ رہتا تھا۔ دونوں میاں بیوی ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں زندگی کے آخری دن گزار رہے تھے۔ بچّے جوان ہو گئے تھے اور اُنھوں نے اپنے الگ گھر بسا لیے تھے۔

شام کو، دن بھر کے کام کاج کے بعد، دونوں بُڑھیا بُڈّھے چولھے کے پاس بیٹھ کر اُن سُہانے دِنوں کو یاد کر کے ٹھنڈی آہیں بھرتے جب وہ جوان تھے۔ اُس وقت یوشیدا کی کمر سرو کی طرح سیدھی تھی اور بازوؤں میں اِتنی طاقت تھی کہ وہ جنگل کا بڑے سے بڑا درخت دو تین گھنٹوں میں گرا لیتا تھا۔ فومی، ہرنی کی طرح، پہاڑیوں پر چوکڑیاں بھرتی پھرتی تھی۔ اُس کی جلد پکے ہوئے آڑو کے چھلکے کی طرح نرم و مُلائم اور بال کالی گھٹا کی طرح گھنے اور سیاہ تھے۔

لیکن افسوس! اب سب کچھ بدل چکا تھا۔ بڑھاپے کی دیمک اُن کی تمام خوب صورتی، تمام طاقت کو چاٹ گئی تھی۔ بدن کا گوشت گُھل گیا تھا۔ کھال لٹک گئی تھی۔ چہرے پر بے شمار سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ چندیا پر ایک بال بھی نہ رہا تھا، اور کمر کمان کی طرح دوہری ہو گئی تھی۔

یوشیدا حسرت سے کہتا "اری فومی! یہ ہم کیا بن گئے ہیں؟"

اور فومی بُرا سا مُنہ بنا کر کہتی "چوسی ہُوئی گنڈیری۔"

اِنسان جب تک زندہ رہتا ہے، اُسے پیٹ پالنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ یوشیدا اب بھی روز صبح کو جنگل میں جاتا، اور وہاں سے لکڑیاں لا کر گلی کوچوں میں بیچتا۔ لیکن اب اُس کے بازوؤں میں اِتنی سکت نہ تھی کہ بڑے درخت کاٹتا۔ بس چھوٹے موٹے درخت اور جھاڑیاں کاٹ کر گُزارا کر رہا تھا۔ فومی بھی اِتنی کم زور ہو گئی تھی کہ اُس سے دو روٹیاں بھی مُشکل سے پکتی تھیں۔ کبھی کبھی تو یُوں ہوتا کہ ہنڈیاں میں ڈوئی چلاتے چلاتے اُونگھ جاتی اور ساری دال جل جاتی۔ اب اُس کی جھونپڑی بھی پہلے جیسی صاف سُتھری نہ رہتی تھی۔

ایک دن دونوں بُڑھیا بُڈّھے سونے کے لیے لیٹے تو اُنھیں جوانی بُری طرح یاد آئی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں کے بل

جھک گئے اور رو رو کر دعا مانگنے لگے "اے پروردگار! تو جو چاہے کر سکتا ہے۔ تیرے لیے کوئی چیز بھی ناممکن نہیں۔ اے پروردگار! ہمیں پھر سے جوان کر دے تاکہ ہم آرام سے زندگی بسر کر سکیں۔ اِس بڑھاپے نے تو ہمیں اپاہج کر کے رکھ دیا ہے"۔ اِسی طرح روتے دھوتے، دُعا مانگتے سو گئے۔

دوسرے دن، صبح کے وقت، یوشیدا کو نیند میں ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اُس سے کہہ رہا ہو "جلدی اُٹھ! جنگل میں جا۔ وہاں خوش قسمتی تیرا اِنتظار کر رہی ہے۔"

وہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا، ہولے سے جھونپڑی کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ جب وہ جنگل میں پہنچا تو ایسا لگا جیسے بہار آ گئی ہو۔ ہرے بھرے درخت خوشی سے جھوم رہے تھے۔ اُن کی شاخوں پر رنگ برنگ پرندے میٹھی میٹھی بولیاں بول رہے تھے۔ ذرا آگے بڑھا تو کیا دیکھتا ہے کہ درختوں کے ایک جُھنڈ میں، ایک چھوٹی سی پہاڑی میں سے ایک چشمہ بہ رہا ہے۔ یہ پہاڑی چشمہ اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس کا پانی اِتنا صاف شفّاف تھا کہ وہ اپنے آپ کو روک نہ سکا، ایک دم نیچے جُھکا، چُلّو میں پانی بھرا اور ایک ہی گھونٹ میں پی گیا۔

پانی پیتے ہی اُسے یُوں لگا جیسے اُس کے بدن میں نئی زندگی دوڑ گئی ہو۔ جُھکی ہوئی کمر ایک دم سیدھی ہو گئی۔ جسم گوشت سے بھر گیا۔ کھال تن گئی۔ اُس نے چشمے کے پانی میں اپنی شکل دیکھی تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُس کے پچکے ہوئے گال گوشت سے بھر گئے تھے، اور اُن پر جوانی کی سُرخی دوڑ رہی تھی۔ وہ آنکھیں جو اندر کو دھنس گئی تھیں، اب اُبھر آئی تھیں اور ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اُس نے سر پر ہاتھ مارا تو وہ بھی سیاہ گھنے بالوں سے ڈھکا ہُوا تھا۔ اُس نے اچھل کر زور سے نعرہ مارا "یا ہُو!" اور سرپٹ بگ ٹٹ گھر کی طرف بھاگا۔

فومی ابھی ابھی سو کر اُٹھی تھی اور مُنہ ہاتھ دھونے جا رہی تھی کہ یوشیدا قلانچیں بھرتا ہوا اندر داخل ہُوا۔ فومی اُسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ بولی "ارے! تو یوشیدا ہی ہے یا کوئی اور ہے؟"

یوشیدا بولا "اری بے وقوف! غور سے دیکھ۔ میں تیرا یوشیدا ہی ہوں۔ میں جوان ہو گیا ہوں۔ خدا نے ہماری سُن لی ہے۔"

"ہماری کہاں سُنی" فومی اُداس ہو کر بولی "تیری سُن لی۔ میں تو ویسی کی ویسی ہی ہُوں۔"

یوشیدا نے کہا "گھبرا مت۔ جنگل میں جا۔ وہاں درختوں کے ایک جُھنڈ میں جوانی کا چشمہ بہ رہا ہے۔ اُس کا پانی پی۔ تو بھی جوان ہو جائے گی۔"

"لے، ابھی جاتی ہوں۔ تو یہیں میرا اِنتظار کر" فومی نے کہا اور لُڑھکتی پُڑھکتی جنگل کی طرف چل دی۔

جب وہ جنگل میں درختوں کے اُس جُھنڈ کے پاس پہنچی جس کا پتا یوشیدا نے بتایا تھا تو وہاں سچ مُچ پانی کا ایک چشمہ بہ رہا تھا۔ وہ چشمے کے کنارے بیٹھ گئی اور چُلّو بھر بھر کے پانی پینے لگی۔

اُدھر یوشیدا، جھونپڑی میں بیٹھا، بڑی بے صبری سے ایک ایک گھڑی گِن رہا تھا۔ ایک گھنٹا گزرا، دو گھنٹے گزرے اور

جب تین گھنٹے گزر گئے تو وہ گھبرا گیا۔ سوچنے لگا، شاید بڑھیا کو چشمہ مِلا نہیں۔ مجھے اُس کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔ یا ہو سکتا ہے وہ جوان ہو کر جنگل میں ہرنوں کے پیچھے دوڑتی پھر رہی ہو۔ چل کر دیکھوں تو، مُعاملہ کیا ہے!

وہ دوڑتا ہوا جنگل میں پہنچا تو کسی بچّے کے رونے کی آواز آئی "ہُوا آں آں۔ ہُوا آں آں۔" اُسے بڑا چنبھا ہُوا۔ آگے بڑھا اور چشمے کے پاس پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک ننھّی سی بچّی زمین پر بیٹھی زور زور سے رو رہی ہے۔ وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ لالچی فومی ایک چُلّو پانی کے بجائے کئی چُلّو پی گئی تھی۔

اب وہ اُسے جنگل میں چھوڑ کر تو جا سکتا نہیں تھا۔ اُس نے اُسے گود میں اُٹھایا اور گھر کی طرف چل دیا۔ بچّی بِلک بِلک کر روئے چلی جا رہی تھی "ہُوا آں آں۔ ہُوا آں آں۔" یوشیدا نے گھر آ کر اُسے چٹائی پر بٹھا دیا اور بولا "اب میں تیرے لیے دُودھ کہاں سے لاؤں؟ دن میں کم سے کم ایک کِلو تو پی ہی جائے گی۔ اِتنا دُودھ میں کس طرح خریدوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ گھٹنوں کے بَل جُھک گیا اور سر جُھکا کر، ہاتھ جوڑ کر بولا "اے پروردِگار! ہمیں مُعاف کر دے۔ ہم سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔ ہم نے تجھ سے وہ چیز مانگی جو نہیں مانگنی چاہیے تھی۔ ہمیں جوانی نہیں چاہیے۔ تُو ہمیں ہمارا بُڑھاپا واپس لَوٹا دے۔" اُس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا اور اِسی طرح بیٹھے بیٹھے سو گیا۔

جب اُس کی آنکھ کُھلی اور اُس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا تو اُن کی کھال لٹکی ہوئی تھی۔ مُنہ میں دانت بھی نہ تھے، اور سر پر بھی کوئی بال نہ تھا۔ وہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ اُس نے اُس چٹائی کی طرف دیکھا جس پر بچّی کو بٹھایا تھا۔ بچّی غائب تھی اور اُس کی جگہ فومی لیٹی ہوئی تھی۔ وہ بھی بوڑھی ہو گئی تھی۔ یوشیدا نے اُسے ہِلایا اور پھر مسکرا کر بولا:

"فومی، سُنو! پودوں میں کلیاں آتی ہیں۔ کلیاں پھُول بنتی ہیں، اور پھُول چند دن بعد مُرجھا کر گِر جاتے ہیں۔ اِسی طرح اِنسان اور حیوان بچّے سے جوان ہوتے ہیں اور پھر بوڑھے ہو کر مرجاتے ہیں۔ یہ قُدرت کا اٹل قانُون ہے۔ اِسے بدلنے کی خواہش کرنا بے وقوفی ہے۔"

"اور یہ بے وقوفی ہم نے کی، اور اِس کی سزا بھگتی" فومی نے سر جُھکا کر کہا۔

سُورج کا گھونسلا

سعید لخت

ہزاروں، لاکھوں سال پہلے کی بات ہے، جب دُنیا نئی نئی بنی تھی۔ ایک سال پرندوں کے دیس میں سخت قحط پڑا۔ بارش کی ایک بُوند تک نہ برسی۔ ندی نالے، چشمے، دریا سب خُشک ہوگئے۔ پودے مُرجھا گئے۔ درخت سُوکھ گئے۔ پھل پھول ناپید ہوگئے۔ پرندے بھُوکوں مرنے لگے۔

چند سیانے پرندوں نے، مِل بیٹھ کر، فیصلہ کیا کہ چاند کے پاس ایک ایلچی بھیجا جائے جو اُس سے بارش برسانے کی درخواست کرے۔ اب سوال پیدا ہُوا کہ یہ کام کون کرے؟ آخر اُنھوں نے قرعہ ڈالا، اور قُرعے میں چمگادڑ کا نام نکلا۔

چمگادڑ اُونچے اُونچے درختوں، آسمان سے باتیں کرتے پہاڑوں پر اُڑتی ہوئی چاند کے پاس پہنچی اور درد ناک آواز میں میں کہنے لگی:

جل بِن جَل گئی دھرتی ساری
بھُوکوں مرگئی خَلقَت ساری

چندا رے چندا مینہ برسا دے

چاند نے مسکرا کر کہا "بہن، میرے پاس تو جل کی ایک بُوند تک نہیں۔ میں مینہ کیسے برسا سکتا ہوں۔ ایسا کرو، ستاروں کے پاس جاؤ۔ شاید وہ تمہاری مدد کر سکیں۔"

چمگادڑ اُوپر اُڑی، اور اُوپر اُڑی، یہاں تک کہ تاروں کے پاس پہنچ گئی۔ تارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ اُنہیں چمگادڑ کا آنا ناگوار گزرا۔ ناک بھوں چڑھا کر بولے "بے وقوف! تمہیں اِتنا بھی پتا نہیں کہ ستاروں میں پانی نہیں ہوتا۔ پانی چاہیئے تو بادلوں کے پاس جاؤ۔"

بادل، سمُندر کے اُوپر، لمبی تانے سو رہے تھے۔ چمگادڑ کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سُنی تو جاگ اُٹھے اور لمبی سی جمائی لے کر بولے "ٹھیک ہے۔ ہم مینہ برسا سکتے ہیں، لیکن خود چل کر کہیں نہیں جاسکتے۔ ہَوا کے پاس جاؤ اور اُس سے کہو کہ ہمیں دھکیل کر جنگل کے اُوپر لے جائے۔"

چمگادڑ بے چاری، بپتا کی ماری، ہانپتی کانپتی ہَوا کے پاس گئی۔ ہَوا بولی "تم دیکھ رہی ہو کہ میں چُپ چاپ کھڑی ہُوں۔ سورج مجھے گرم کرتا ہے تو میں چلتی ہُوں۔"

"تو کیا میں سورج کے پاس جاؤں؟" چمگادڑ نے کہا۔

"ہاں، سورج کے پاس جاؤ" ہوا بولی "اور اُس سے کہو، اپنی دہکتی ہوئی کرنیں زمین پر ڈالے۔ زمین گرم ہوگی تو میں بھی گرم ہوں گی، اور گرم ہوکر اُوپر اُٹھوں گی۔ ہوا کی یہ خاصیّت ہے کہ گرم ہوکر اُوپر اُٹھتی ہے۔"

چمگادڑ سورج کی طرف بڑھی تو اُس نے دہاڑ کر کہا:
"خبردار! آگے مت بڑھنا۔ قریب آئیں تو جل کر راکھ ہو جاؤ گی۔"

چمگادڑ سہم گئی۔ پھر عاجزی سے بولی:

جل بِن جل گئی دھرتی ساری
بُھوکوں مرگئی خلقت ساری

سورج بھیّا مینہ برسا دے

سورج نے کہا "ٹھیک ہے۔ میں تمہاری مدد کر سکتا ہُوں۔ لیکن ایک شرط ہے۔ جب مینہ برسے، سارا جنگل ہرا بھرا ہو جائے تو جنگل کے سب سے گھنے اور اُونچے درخت کی چوٹی پر میرے لیے ایک گھونسلا بنا دینا۔ مجھے روز شام کو، بہت دُور، اُفق کے پار، سونے کے لیے جانا پڑتا ہے۔ جنگل میں گھر ہو گا تو رات کو وہیں سو جایا کروں گا۔"

چمگادڑ چہک کر بولی "سورج بھیّا، جنگل میں بہت سے پرندے ہیں۔ وہ بڑی خوشی سے آپ کے لیے گھونسلا بنا دیں گے۔ بس آپ ہوا کو گرم کر دیں تاکہ وہ بادلوں کو اُڑا کر جنگل پر لے آئے۔"

چمگادڑ خوشی سے جھومتی ہوئی جنگل میں آئی اور پرندوں کو یہ خوش خبری سُنائی۔ ابابیل بولی "یہ کون سا مشکل کام ہے۔ ہم سب مِل کر ایک ہی دن میں گھونسلا بنا دیں گے۔"

"بوڑھے برگد کی چوٹی پر" طوطے نے کہا۔

"ہاں، اچھا سا، پیارا سا۔ دھنک کے سات رنگوں سے سجا ہُوا" مور بولا۔

دوسرے دن، صُبح کو، سورج مشرق سے نِکلا۔ اُس نے زمین پر تیز گرم شُعاعیں ڈالیں۔ زمین گرمی سے تپنے لگی۔ زمین کی تپش سے ہَوا گرم ہوئی، گرم ہو کر ایک دم اُوپر اُٹھی اور بادلوں کو دھکیل کر جنگل کے اُوپر لے گئی۔ بادلوں نے اپنے پیٹ کا تمام پانی اُگل دیا۔ خوب مُوسلا دھار بارش ہوئی۔ ندی نالے بھر گئے۔ جل تھل ایک ہو گیا۔

یہ پل بھر میں کیا ماجرا ہو گیا
کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا

زمین پر ہری ہری گھاس کا فرش بچھ گیا۔ درختوں میں کونپلیں پھُوٹیں، پھول کھلے اور پھول پھل بنے۔ پرندوں نے خوب مزے لے لے کر کھائے۔ جب پیٹ بھرا تو تفریح کی سُوجھی۔ سب نے مِل کر فیصلہ کیا کہ جنگل میں تین دن تک جشن منایا جائے۔ چمگادڑ نے اُنہیں وعدہ یاد دلایا اور کہا کہ جشن بعد میں منانا، پہلے سورج کے لیئے گھونسلا بناؤ۔ لیکن پرندے کام کرنے کے مُوڈ میں نہ تھے۔

مور نے کہا "مجھے ناچنے کی مشق کرنی ہے۔"

ابابیل بولی "مجھے بانسری کی پریکٹس کرنی ہے۔"

اُلّو بولا "مجھے ڈھول کسنا ہے۔ ڈھیلا ہو گیا ہے۔"
"اور ہمیں گلا صاف کرنا ہے" مینا اور کویل نے کہا "جشن میں گائیں گے نا۔"

چمگادڑ سمجھ گئی کہ یہ ناشکرے پرندے گھونسلا بنانا نہیں چاہتے۔ یُوں ہی ٹال مٹول کر رہے ہیں۔ "اب میں کیا کروں؟" وہ سوچنے لگی "مجھے گھونسلا بنانا نہیں آتا۔ اور اگر آتا بھی تو اکیلی اِتنا بڑا گھونسلا کیسے بنا سکتی تھی جس میں سورج آرام کر سکے؟

سورج ڈُوبا۔ چاند نِکلا۔ پرندوں کا جشن شروع ہُوا۔ ڈھولک پر تھاپ پڑی۔ بانسری نے تانیں اُڑائیں۔ سارے پرندے ناچنے گانے لگے۔ صِرف چمگادڑ، شرم کے مارے ایک کونے میں مُنہ چھُپائے بیٹھی تھی۔ سوچ رہی تھی، سورج کو کیا مُنہ دکھاؤں گی۔ یہی سوچتے سوچتے سو گئی۔

اور پھر نہ جانے کب اُس کی آنکھ کُھل گئی۔ ہڑبڑا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ چاند چھُپ گیا تھا۔ ستاروں کی روشنی ماند پڑ گئی تھی۔ سورج نکلنے والا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مشرق سے سورج کا چمکتا دمکتا مُکھڑا نمودار ہُوا۔ اُس کا خیال تھا کہ پرندوں نے اُس کا گھونسلا بنا دیا ہو گا ۔ لیکن وہ اُسے کہیں نظر نہ آیا۔ اُس نے چمگادڑ کو دیکھنے کی کوشش کی تو وہ بھی دِکھائی نہ دی۔ وہ تو شرم کے مارے کیلے کے پتّے کے پیچھے چھپی بیٹھی تھی۔ سورج ہولے ہولے چلتا ہُوا آسمان کے بیچوں بیچ آ گیا۔ اُس کی ایک کِرن کیلے کے پتّے پر پڑی تو چمگادڑ گھبرا کر وہاں سے بھاگی۔ سورج نے اُسے دیکھ لیا تھا!

وہ اُڑی چلی جا رہی تھی کہ نیچے ایک غار دِکھائی دیا۔ اُس نے غوطہ لگایا اور سیدھی غار کے اندر گھُس گئی۔ یہاں وہ سورج کی نظروں سے بچ سکتی تھی۔ سورج آہستہ آہستہ مغرب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس نے جنگل کے درختوں پر آخری بار نظر ڈالی کہ شاید کسی درخت کی چوٹی پر گھونسلا نظر آ جائے، لیکن بے کار۔ گھونسلا ہوتا تو دکھائی دیتا۔ اُس نے مایوسی سے سر جُھکایا اور اُفق کے پار، مغرب میں، ڈُوب گیا۔

چمگادڑ ساری رات غار میں چُھپی رہی۔ دوسرے دن بھی باہر نہیں نکلی۔ کئی دِن اور کئی راتیں اِسی طرح بیت گئیں۔ آخر جب بھوک سے بے تاب ہوئی تو ہِمّت کر کے باہر نکلی، لیکن دن میں نہیں، رات کو۔ جب سورج ڈوب گیا تھا۔

دِن گزرتے گئے، مہینے گزرتے گئے، سال بیتتے گئے۔ پرندوں نے سورج کے لیے گھونسلا نہیں بنایا۔ انہیں کھانے پینے اور ناچنے گانے ہی سے فرصت نہ تھی۔ سورج نے بھی اُمید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ وہ ہر روز صبح کو درختوں کی چوٹیوں پر نظر ڈالتا اور پھر شام کو مغرب میں غروب ہو جاتا۔

سال ہا سال تک یہی ہوتا رہا۔ سورج ہوا کو گرم کرتا رہا۔ ہوا بادلوں کو اُڑا کر جنگل کے اُوپر لاتی رہی، اور بادل مینہ برساتے رہے۔ یہ کھیل اب تک ہو رہا ہے۔ سورج کو اب بھی اُمید ہے کہ پرندے ایک نہ ایک دن اُس کا گھونسلا ضرور بنا دیں گے۔

رہی چمگادڑ تو وہ بے چاری، لاج کی ماری، سورج سے چُھپتی پھرتی ہے۔ دِن بھر اندھیرے غاروں اور ٹوٹی پھوٹی عمارتوں کے اندر اُلٹی لٹکی رہتی ہے اور جب سورج ڈُوب جاتا ہے تو خوراک کی تلاش میں باہر نکلتی ہے۔ (ٹولول وا مارٹی مولل کی، کہانی "اے برامس ٹو دِی سَن" سے ماخوذ)۔

مُورکھ نگر کے مُورکھ

کسی زمانے میں مُورکھ نگر کا نام "عقل مند نگر" تھا اور یہاں کے لوگ دُنیا کے سب سے زیادہ عقل مند انسان سمجھے جاتے تھے۔ اُن کی دانائی اور سمجھ بُوجھ کی اِتنی شہرت تھی کہ جب کوئی بادشاہ، وزیر یا امیر کسی مُصیبت یا اُلجھن میں گرفتار ہوتا تو اِن عقل مند لوگوں کو بُلا کر صلاح مشورہ کرتا۔

عقل مند نگر میں باہر کے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا، جو یہاں کے عقل مندوں کو لینے کے لیے دُور دراز ملکوں سے آتے تھے۔ عقل مند نگر کے عقل مند لوگ کچھ دن تو اپنی اِس عزّت اور شہرت سے بہت خوش ہوئے، مگر پھر اُن کی عقل مندی اُن کے لیے وبالِ جان بن گئی۔ بے چاروں کو اِتنا وقت بھی نہیں ملتا تھا کہ کچھ دیر اپنے بیوی بچّوں کے ساتھ چین سے بیٹھ سکیں۔ ایک جگہ سے آتے تو دوسری جگہ سے بُلاوا آجاتا۔ وہاں سے واپس آتے تو تیسری جگہ سے قاصِد دوڑے چلے آتے۔ غرض نہ دن کو چین تھا نہ رات کو آرام۔

اِن عقل مند لوگوں سے زیادہ اِن کی بیویاں پریشان تھیں۔ ایک دن جب کہ بستی کے لوگ کسی بادشاہ کے بُلاوے پر گئے ہوئے تھے، اُن کی عورتیں ایک جگہ جمع ہوئیں اور کافی بحث اور مغز پچی کے بعد اِس نتیجے پر پہنچیں کہ ساری خرابی عقل مندی کی ہے۔ نہ ہمارے مرد اِتنے عقل مند ہوتے اور نہ لوگ اِنہیں مشورے کے لیے بُلاتے۔ کوئی صورت ایسی کرنی چاہیئے کہ عقل مند نگر کے لوگ مُورکھ یعنی بے وقوف مشہور ہو جائیں۔ پھر کوئی اِنہیں مشورے کے لیے نہیں بُلائے گا۔ اِن عورتوں میں ایک بُڑھیا آفت کی پُڑیا تھی۔ اُس نے ایک ایسی ترکیب بتائی کہ ساری عورتیں خوشی سے جھوم گئیں۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی بستی کی عورتوں نے گھروں کو جھاڑ پونچھ کر صاف کر دیا۔ بچّوں کو نہلا دُھلا، سُرمہ لگا، پھول پھول کے کپڑے پہنائے اور خود بھی ٹِک سُک سے دُرست ہو، بن سنور کر بیٹھ گئیں۔

شام کو عقل مند نگر کے عقل مند لوگ واپس آئے تو دروازوں پر اُن کی بیویاں سُرخ جوڑے پہنے، ہاتھوں میں

پھولوں کے ہار لیئے، ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے، اِستقبال کے لیے کھڑی تھیں۔

مردوں نے گھر میں قدم رکھا تو حیران رہ گئے۔ کہاں تو یہ حالت تھی کہ گھر کباڑی کی دُکان معلوم ہوتے تھے اور کہاں اب یہ حالت کہ در و دیوار پر نُور برس رہا ہے اور ہر چیز سلیقے اور قرینے سے اپنی اپنی جگہ رکھی ہے۔ بیویاں تھیں کہ مارے خاطر کے اُن کے آگے بچھی جاتی تھیں۔ بچے ابّا ابّا کہہ کر گلے میں بانہیں ڈال رہے تھے۔ اُس دن نہ تو بیویاں اپنے شوہروں سے لڑی جھگڑیں اور نہ بچّوں نے غُل غپاڑا مچا کر اُن کے آرام میں خلل ڈالا۔ عقل مند نگر کے عقل مند لوگوں کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ جنّت میں آ گئے ہیں۔ اُنہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ بستی سے باہر قدم نہیں نکالیں گے۔ چاہے کوئی بادشاہ بُلائے یا بادشاہ کا باپ۔

ایک دن ہنسی خوشی گزر گیا۔ لیکن دوسرے ہی دن کسی بادشاہ کے سپاہی بستی میں آموجود ہوئے اور لوگوں کو حکم دیا کہ فوراً ہمارے ساتھ چلو۔ ہمارے بادشاہ سلامت ایک کٹھن معاملے میں تم سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔

عقل مند نگر کے عقل مند لوگ یہ سُن کر بہت پریشان ہوئے۔ اُنہوں نے بہت سوچا، بہت دماغ لڑایا لیکن چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہ آئی، اور وہ لوگ جو دوسروں کی مُصیبتیں دور کرنے کے لیے تدبیریں سوچا کرتے تھے، اپنی مُصیبت دور کرنے کے لیے کوئی تدبیر نہ سوچ سکے۔ آخر اِس کڑے وقت میں اُن کی بیویاں کام آئیں۔ اُنہوں نے اپنے مردوں کو ایک ایسی ترکیب بتائی کہ خوشی کے مارے اُن کی باچھیں کِھل گئیں۔

بادشاہ کے سپاہی بڑی بے صبری سے اُن کا اِنتظار کر رہے تھے۔ عقل مند نگر کے عقل مند لوگوں نے اُن کو دَم دِلاسا دیا اور بولے "بس آج اور کل کی مُہلت دو۔ ہمیں ایک ضروری کام ہے۔ پرسوں ہم ضرور آپ کے ساتھ چلیں گے۔" سپاہی مان گئے، کیوں کہ وہ عقل مند نگر کے عقل مند لوگوں کو ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔

دوسرے دن تڑکے ہی بستی کے تمام لوگوں نے کاندھوں پر ہل اُٹھائے، جھولیوں میں بہت سا نمک بھرا اور کھیتوں کی سمت روانہ ہو گئے۔ سپاہی بھی ساتھ تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ لوگ کھیتوں میں کیا چیز بوئیں گے اور اِتنا ڈھیر سارا نمک اُنہوں نے اپنے ساتھ کیوں لیا ہے! ایک سپاہی نے ہِمّت کر کے اُن سے پوچھا "اے دنیا کے سب سے زیادہ عقل مند لوگو! تم کون سی فصل بوؤ گے؟"

عقل مند لوگوں نے جواب دیا "یہ نمک بونے کا موسم ہے۔ ہم اپنے کھیتوں میں نمک بوئیں گے۔"

سپاہیوں نے یہ سُن کر پہلے تو اُن لوگوں کی صورت غور سے دیکھی، پھر ایک دوسرے کو دیکھا اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئے۔ اُنہوں نے اپنے بادشاہ سے جا کر کہا کہ عقل مند نگر کے عقل مند لوگوں نے اپنی عقلوں سے اِتنا زیادہ کام لیا ہے کہ اُن کے بھیجے میں عقل بالکل ختم ہو گئی ہے اور اب وہ بے وقوف بن گئے ہیں۔

اُس رات ساری بستی میں چراغاں کیا گیا۔ گھر والیوں نے اپنے گھروں کو دُلھن کی طرح سجایا اور ایسے خوش رنگ، خوش ذائقہ اور خوش بُو دار کھانے پکائے کہ عقل مند نگر کے عقل مند لوگ اُنگلیاں چاٹتے رہ گئے۔

اُن لوگوں کا خیال تھا کہ اُن کی بے وقوفی کی کہانی تمام شہروں میں پھیل چکی ہو گی اور اب بادشاہ، وزیر یا امیر اُنہیں صلاح مشورے کے لیے نہیں بُلائیں گے۔ لیکن چوتھے ہی روز ایک راجا کے سپاہی آ دھمکے۔ اُن لوگوں کی ساری خوشیاں ملیامیٹ ہو گئیں، مُنہ لٹک گیا، چہروں پر اُداسی چھا گئی اور وہ فکر مند نگاہوں سے ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے۔ اِس دفعہ بھی اُن کی بیویاں ہی کام آئیں۔ اُنہوں نے کہا "سپاہیوں سے دو ہفتوں کی مُہلت لے لو، اور جیسا ہم کہیں ویسا کرو"۔

سپاہی ہُوا کے گھوڑوں پر سوار تھے۔ اُن کا ایک ایک

منٹ، ایک ایک پل قیمتی تھا۔ وہ بہت غصّے ہوئے، ڈانٹا ڈپٹا، دھمکیاں دیں مگر عقل مند نگر کے عقل مند لوگوں نے دو ہفتوں کی مُہلت لے کر ہی چھوڑی۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی عقل مند لوگوں نے بستی کے بیچوں بیچ ایک جگہ صاف کی اور وہاں ایک عمارت بنانی شروع کر دی۔ سپاہیوں نے پوچھا "یہ نئی عمارت کس لیے تعمیر کی جارہی ہے؟"

"یہ بستی کی چوپال ہے" عقل مند لوگوں نے جواب دیا۔

"مگر چوپال تو تمہارے ہاں موجود ہے" سپاہیوں نے حیرت سے کہا۔

"اُس چوپال میں کھڑکیاں بہت کم ہیں، اِس لیے اُس میں زیادہ روشنی نہیں آتی" عقل مند لوگوں نے جواب دیا۔

دو ہفتوں کی محنت کے بعد نئی چوپال بن کر تیار ہوگئی۔ مگر یہ دُنیا کی عجیب و غریب عمارت تھی، کیوں کہ اِس میں نہ تو کوئی کھڑکی تھی اور نہ کوئی دروازہ۔ سپاہیوں نے دیکھا تو حیرت کے مارے آنکھیں پھاڑ دیں۔ بولے "اے دنیا کے سب سے زیادہ عقل مند لوگو! تم اِس عمارت کے اندر داخل کیسے ہو گے؟"

عقل مند لوگوں نے احمقوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر سر پیٹ کر بولے "ارے! دروازہ بنانا تو ہم بھول ہی گئے؟"

آخر بڑی سوچ بچار کے بعد ان کا چودھری بولا "بس، اب ایک ہی صورت ہے۔ چھت میں بڑا سا سُوراخ کر دو۔ اُس راستے سے لوگ اندر باہر آیا جایا کریں گے۔"

یہ سُن کر چند عقل مند دوڑے دوڑے گئے اور دو چار سیڑھیاں اور لمبی لمبی رسّیاں لے آئے۔ اِن سیڑھیوں کی مدد سے دو آدمی چھت پر چڑھے اور آریوں سے چھت کا تھوڑا سا حصّہ کاٹ کر، عمارت کے اندر رسّیاں لٹکا دیں۔

راجا کے سپاہی حیرت سے کبھی اِس انوکھی عمارت کو دیکھتے اور کبھی دُنیا کے اِن سب سے زیادہ عقل مند لوگوں کو۔۔۔ آخر ایک سپاہی آگے بڑھا اور اُس نے کہا "اے عقل مند لوگو! تم نے کہا تھا کہ پُرانی چوپال میں کھڑکیاں کم ہیں، اِس لیے اُس میں کافی روشنی نہیں آتی۔ لیکن اِس عمارت میں کھڑکی تو درکنار کوئی چھوٹا سا سُوراخ بھی نہیں۔ عمارت کے اندر روشنی کیسے جائے گی؟"

یہ سُن کر عقل مند لوگ پھر سر جوڑ کے سوچنے بیٹھے۔ کچھ دیر بعد اُن کی سمجھ میں ایک تدبیر آگئی۔ اُنہوں نے اپنے کاندھوں پر بڑے بڑے تھیلے رکھے اور پاس کی ایک پہاڑی پر چڑھ گئے۔ دِن ڈھل چُکا تھا اور ڈُوبتے سورج کی سُنہری کرنیں چٹانوں کے شگافوں میں سے چھَن چھَن کر پتھریلی زمین پر پڑ رہی تھیں۔ عقل مند لوگوں نے اپنے تھیلوں کے رُخ کرنوں کی طرف کر دیے اور اُن میں خوب ٹھونس ٹھونس کر کرنیں بھرنے لگے۔

سپاہیوں نے دونوں ہاتھوں سے سر پیٹ لیا اور چِلّا کر بولے "اے عقل مندو! تم یہ کیا کر رہے ہو؟"

عقل مندوں نے جواب دیا "ہم اِن تھیلوں میں سورج کی کرنیں بھر رہے ہیں۔ اِن تھیلوں کو ہم عمارت میں اُلٹ دیں گے تو ساری عمارت سورج کی روشنی سے جگ مگانے لگے گی۔"

سپاہی یہ سُن کر ایسے بگٹُٹ بھاگے کہ پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔

اُس دن سے عقل مند نگر کے عقل مند لوگ ساری دنیا میں مُورکھ یعنی بے وقوف مشہور ہو گئے اور عقل مند نگر کا نام مُورکھ نگر رکھ دیا گیا۔ وہ دن اور آج کا دن، پھر کبھی کسی بادشاہ، راجا، امیر یا وزیر کا کوئی قاصد اُنہیں بُلانے نہیں آیا اور مُورکھ نگر کے مُورکھ لوگ اپنے بال بچّوں کے ساتھ سکھ چین سے رہنے لگے۔

(سعید لخت)

شاباش انسپکٹر سعید

شام کا وقت تھا ۔ سہ پہر سے مینہ کی جھڑی لگی ہوئی تھی ۔ شہر کی سڑکیں سُنسان تھیں اور سوائے اِکا دُکا موٹروں کے اور کوئی ٹریفک نہ تھی ۔ ایسے میں غالب بینک لمیٹڈ کی ایک شاخ سے بینک کی وین رُوپیہ لے کر بینک کے ہیڈ آفس جا رہی تھی ۔ یہ روز کا دستُور تھا ۔ دِن میں جتنا رُوپیہ بینک میں جمع ہوتا، شام کو ہیڈ آفس پہنچا دیا جاتا۔

ڈرائیور کے عِلاوہ وَین میں دو چوکیدار تھے ۔ دونوں کے ہاتھوں میں بھری ہُوئی بندوقیں تھیں ۔ اُن کے سامنے والی سیٹ پر نوٹوں سے بھرے ہُوئے دو بیگ رکھے تھے۔ سڑک کی بتیاں روشن تھیں لیکن بارش کی وجہ سے راستہ صاف نظر نہ آرہا تھا ۔

وَین بَرکی اِسٹریٹ سے نکل کر کُھلی سڑک پر آئی ہی تھی کہ اچانک کالے رنگ کی ایک ٹیوٹا کار بائیں جانب سے آئی اور وَین کا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی ۔ وَین کا ڈرائیور بریک نہ لگاتا تو تصادُم یقینی تھا ۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اتنے میں ایک ڈاٹسن کار دائیں جانب سے آئی اور ان دونوں کاروں کے پاس آکر رُک گئی ۔ اُس میں سے ایک نقاب پوش ڈاکو اُترا اور بجلی کی سی تیزی سے وین کے ڈرائیور کی طرف بڑھا ۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا ۔

عین اُسی وقت ٹیوٹا کار میں سے چار نقاب پوش ڈاکو نکلے اور انھوں نے وَین کا دروازہ کھول کر چوکیداروں پر حملہ کر دیا ۔ چوکیداروں نے مُزاحمت کی، مگر دو اور چار کا مُقابلہ تھا۔ ڈاکوؤں نے سروں پر پستولوں کے دستے مار مار کر اُنھیں بے ہوش کر دیا ۔ اُدھر وہ پہلا آدمی ڈرائیور کو بے ہوش کر چُکا تھا ۔ ڈاکوؤں نے تینوں آدمیوں کو وین سے گھسیٹ کر سڑک پر ڈال دیا ۔ دو ڈاکو وین میں سوار ہو گئے۔ باقی تین ٹیوٹا میں، اور آناً فاناً دونوں گاڑیاں ہوا ہو گئیں ۔

تقریباً دو ڈھائی میل دُور جا کر بینک کی وین ایک مکان کے دروازے پر رُک گئی ۔ یہاں ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ ڈاکوؤں نے وین سے نوٹوں کے بیگ نکالے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر فرار ہو گئے ۔

اِنسپکٹر سعید کے دفتر میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ۔ اُس نے ریسیور کان سے لگایا اور پھر ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہُوا ۔ اُسے اِسی ڈکیتی کے بارے میں بتایا گیا تھا ۔ وہ دو تین کانسٹیبلوں کو لے کر فورًا اس جگہ پہنچا جہاں ڈکیتی کی واردات ہُوئی تھی ۔

وَین کا ڈرائیور اور چوکیدار ہوش میں آگئے تھے مگر ان کے سر میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں ۔ ڈرائیور نے رُک رُک کر بڑی مشکل سے بتایا:

"یہ سب کچھ اچانک ہوگیا ۔ اُنھوں نے ایک دم ہمیں آلیا اور بے ہوش کر کے سڑک کے کنارے ڈال گئے ۔ کچھ ڈاکو ٹیوٹا میں آئے تھے اور کچھ ڈاٹسن میں ۔ ٹیوٹا کا نمبر BX275 تھا ... ہاں ۔۔۔ یہی نمبر تھا ۔ مجھے خوب یاد ہے"۔

اِنسپکٹر نے وائرلیس کے ذریعے اپنے ہیڈ کوارٹر کو اِطّلاع دی ۔ اِس کے بعد اُس نے سڑک کا مُعاینہ کیا کہ شاید ڈاکو کوئی سُراغ چھوڑ گئے ہوں ۔ اُسے قریب ہی ایک بڑا سا رُومال پڑا ہُوا ملا جسے کسی ڈاکو نے نقاب کے طور پر اِستعمال کیا ہو گا ۔ اِس کے عِلاوہ چند بٹن بھی ملے جو شاید چوکیداروں کے ساتھ ہاتھا پائی میں کسی ڈاکو کے ٹُوٹ گئے تھے۔

"جب ہاتھا پائی ہوتی ہے تو ڈاکو اپنی کوئی نہ کوئی چیز ضرور چھوڑ جاتے ہیں" انسپکٹر نے اپنے ساتھیوں سے کہا "اِنھیں سنبھال کر رکھ لو، کام آئیں گی"۔

دُوسرے دن صُبح کو ہیڈ کانسٹیبل نے انسپکٹر کو آکر بتایا "دونوں کاروں کا کھوج لگالیا گیا ہے ۔ یہ کاریں ڈاکے سے کچھ دیر پہلے چُرائی گئی تھیں"۔

"ٹھیک ہے ۔ انھیں یہاں لے آؤ" انسپکٹر نے کہا "اور سُنو ۔ کاروں کے مالکوں سے کہو، میں اُن سے ملنا چاہتا ہُوں"۔

ٹیوٹا کار ایک ڈاکٹر کی تھی اور ڈاٹسن کسی اخبار کے اڈیٹر کی وہ بے چارے سخت پریشان تھے اور بار بار پولیس کا شکریہ ادا کر رہے تھے ۔ ڈاکٹر کی کار میں سے نقب لگانے کے اوزار نکلے اور اڈیٹر کی کار میں سے ایک پُرانی برساتی (رین کوٹ) ۔

"ہمیں چار سُراغ مل چکے ہیں" انسپکٹر نے سوچتے ہوئے کہا "رُومال یعنی نقاب، نقب زنی کے اوزار، کوٹ کے بٹن اور .... یہ برساتی ۔ ان چاروں میں سے صرف ایک چیز ایسی ہے جو ہمارے کام آسکتی ہے، اور وہ ہے .... برساتی"۔

انسپکٹر برساتی کے کالر کے اندر ایک دُھندلے سے نشان کی طرف اشارہ کر کے بولا "یہ اُس لانڈری کا نشان ہے جہاں یہ برساتی دُھلوائی گئی تھی۔ اگر ہم نے اس لانڈری کا پتا چلالیا تو پھر برساتی کے مالک کا پتا بھی چل جائے گا ۔ پھر اُس کے ذریعے ہم دُوسرے ڈاکوؤں کا کھوج لگا سکتے ہیں ۔ آؤ، کام شروع کر دیں"۔

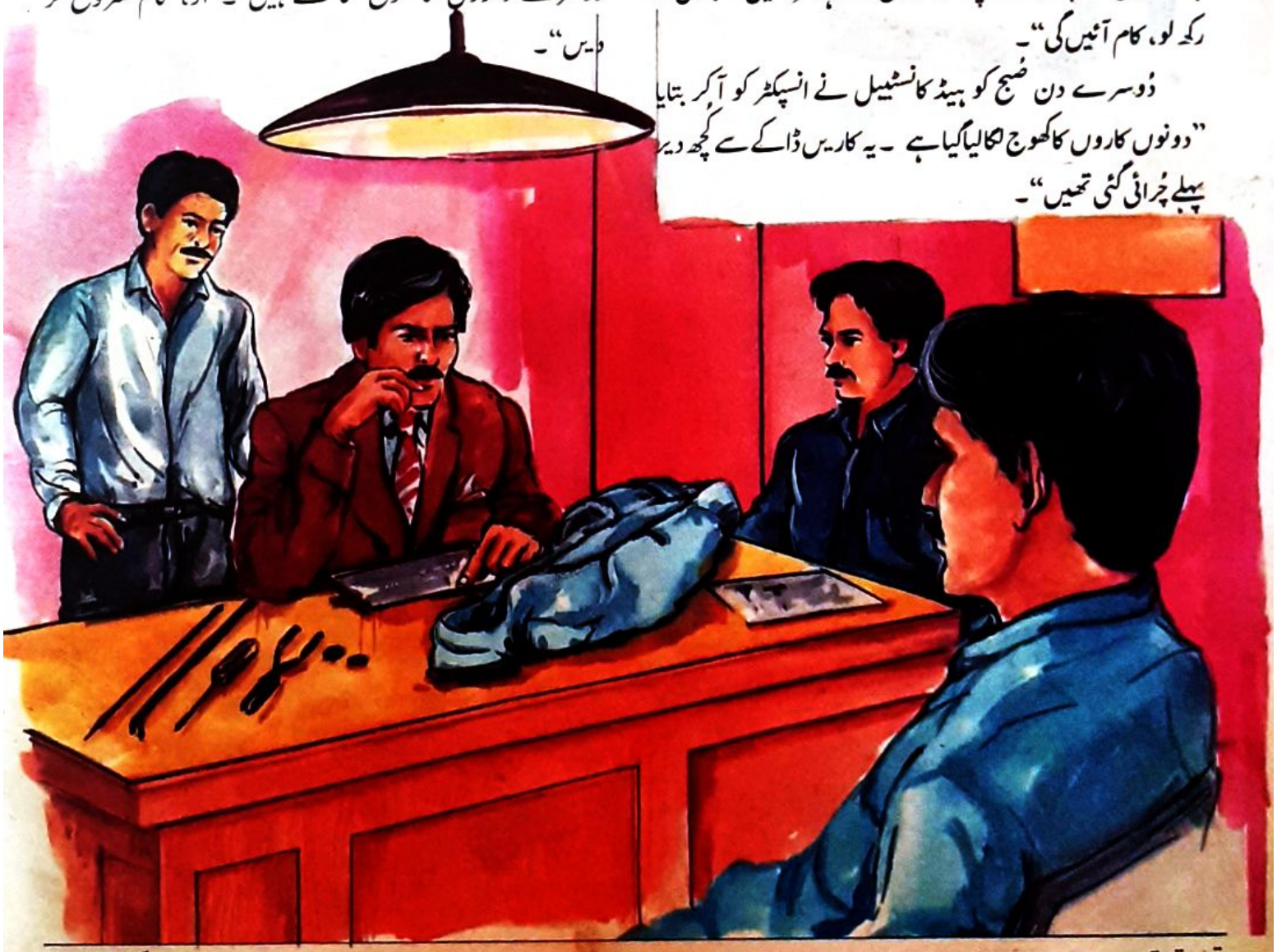

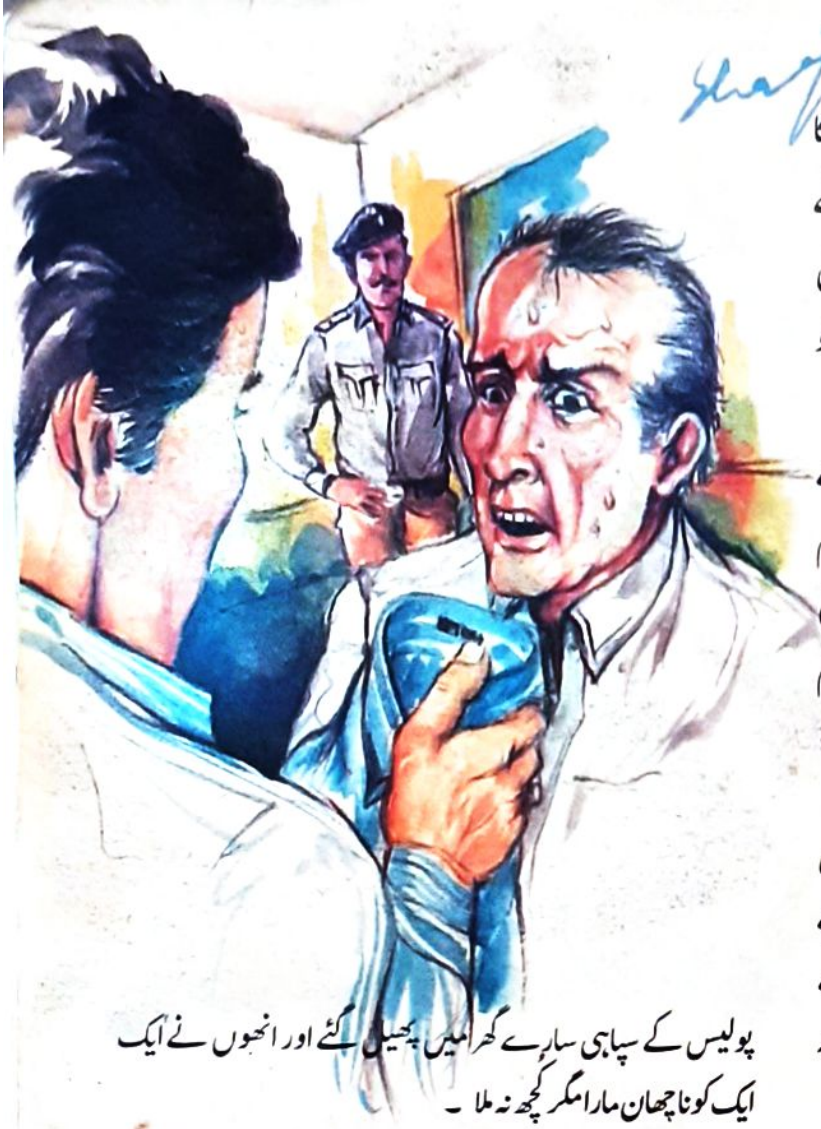

چوبیس گھنٹے کے اندر اندر پولیس نے لانڈری کا کھوج لگا لیا ۔ اُس کا نام دِل شاد لانڈری تھا اور وہ شہر کے ایک گنجان محلّے میں تھی ۔ انسپکٹر سعید نے لانڈری کے مالک کو ڈکیتی کے متعلق تفصیل سے بتایا اور کہا "اگر برساتی کا مالک مل جائے تو ڈاکوؤں کو پکڑنے میں مدد مل سکتی ہے"

لانڈری کے مالک نے بے زاری سے سر ہلایا اور بولا "میرے پاس دن میں بیسیوں گاہک آتے ہیں ۔ اب میں کس کس کا نام پتا یاد رکھوں؟ اور پھر اس نشان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ برساتی سال ڈیڑھ سال پہلے دُھلوائی گئی تھی ۔ اِتنی پُرانی رسیدیں ہم سنبھال کر نہیں رکھتے ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں .... آہا! ذرا ٹھہریے" اُس نے برساتی کا کونا غور سے دیکھتے ہُوئے کہا:

"یہ .... یہ وہی ہے ۔ مجھے یاد آگیا ۔ اِس کا کونا استری کرتے وقت جل گیا تھا اور میں نے اس کے مالک کو 20 روپے دے کر جان چُھڑائی تھی ۔ صاحب ، بڑا ظالم آدمی تھا۔ میں اُسے رُوپے نہ دیتا تو میرا سر پھوڑ دیتا ۔ یہ کوئی چھ مہینے پہلے کا واقعہ ہے۔ ٹھہریے، میں رسید بُک نکال کر دیکھتا ہُوں"

اُس نے چھ مہینے پہلے کی رسید بُکیں نکالیں اور پندرہ منٹ انھیں اُلٹ پُلٹ کرنے کے بعد چِلّا کر بولا "یہ رہی وہ رسید۔ اس کا نام عبدالرّشید ہے اور پتا ہے، گلی نمبر 10 بھاگوان پورہ"۔

انسپکٹر سعید لانڈری والے کا شکریہ ادا کر کے اُسی وقت عبدُالرّشید کے گھر پہنچا اور اسے برساتی دکھا کر بولا "یہ برساتی غالباً آپ کی ہے؟"

"جی ہاں .... میری ہی ہے اور کچھ دن ہوئے چوری ہو گئی تھی" عبدُالرّشید نے بڑے اِطمینان سے کہا "یہ آپ کو کہاں سے ملی؟"

انسپکٹر نے اُسے ساری تفصیل بتائی اور کہا "اگر میں آپ کے گھر کی تلاشی لوں تو آپ کو کوئی اِعتراض تو نہ ہو گا؟"

"ارے صاحب، مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے" وہ ہنس کر بولا "جو مرضی چاہے کیجیے ۔ آپ کو اِختیار ہے ۔ البتّہ اتنا میں بتا دُوں کہ میں ایک شریف آدمی ہُوں۔ ڈاکا ڈالنا تو بڑی بات ہے، میں نے آج تک کسی کا تِنکا تک نہیں چُرایا ۔"

انسپکٹر نے اپنے آدمیوں کو گھر کی تلاشی لینے کا حکم دیا ۔ پولیس کے سپاہی سارے گھر میں پھیل گئے اور انھوں نے ایک ایک کونا چھان مارا مگر کچھ نہ ملا ۔

ایک کانسٹیبل مکان کی چھت پر چڑھ گیا ۔ اوپر کوئی کمرا نہ تھا ۔ صرف دائین جانب پانی کی ٹنکی تھی ۔ کانسٹیبل مایوس ہو کر نیچے اُترنے ہی والا تھا کہ اُسے ٹنکی کے پیچھے کوئی چیز نظر آئی ۔ اُس نے آگے بڑھ کر غور سے دیکھا ۔ یہ ایک سُوٹ کیس تھا ۔ اس نے انسپکٹر کو آواز دی "صاحب! اُوپر آئیے۔"

انسپکٹر دوڑتا ہوا اُوپر پہنچا اور ٹنکی کے پیچھے دیکھا تو وہاں ایک کے بجائے دو سُوٹ کیس رکھے ہوئے تھے، نوٹوں سے لبالب بھرے ہُوئے۔

"کھیل ختم ہو گیا" انسپکٹر نے عبدالرّشید سے کہا "میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلو!"

تھانے جا کر انسپکٹر نے عبدُالرّشید سے اُگلوا لیا کہ وہ بھی ڈکیتی میں شریک تھا اور شام تک اُس نے اپنے دوسرے ساتھیوں کے نام بھی بتا دیے ۔ پولیس نے اُنھیں بھی چھاپے مار کر پکڑ لیا ۔

"مُجرم اپنے پیچھے کوئی نہ کوئی سُراغ ضرور چھوڑ جاتے ہیں" انسپکٹر سعید نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا "اِس مرتبہ وہ برساتی چھوڑ گئے اور اس کی مدد سے ہم انھیں پکڑنے میں کام یاب ہو گئے"۔

واہ وا! انسپکٹر سعید

سعید لخت

انسپکٹر سعید جہاز کے عرشے پر کھڑا سمندر کی موجوں کو دیکھ رہا تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی اور موسم خوش گوار تھا۔ وہ ایک سرکاری کام سے بحرین گیا تھا اور ایک ہفتے کے بعد واپس آ رہا تھا۔

انسپکٹر سے چند گز کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بچّی اپنی ماں کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں گڑیا تھی اور وہ اسے سینے سے لگا کر تھپک رہی تھی۔

اچانک جہاز کو جھٹکا لگا اور وہ تھوڑا سا ایک طرف کو جھک گیا۔ انسپکٹر سعید اور عورت نے تو اپنے آپ کو سنبھال لیا مگر بچّی جنگلے سے ٹکرا گئی اور گڑیا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔ اگر انسپکٹر دوڑ کر گڑیا کو نہ پکڑ لیتا تو وہ سمندر میں گر پڑتی

بچّی نے انسپکٹر سعید کا شکریہ ادا کیا اور گڑیا اس کے ہاتھ سے لے لی۔ انسپکٹر سعید نے محسوس کیا کہ بچّی کی ماں کا منھ فق ہو گیا ہے۔ اس نے بچّی کے ہاتھ سے گڑیا چھین لی اور بولی:

"میں نے کہا تھا نا کہ اسے مجھے دے دو۔ اگر اس شریف آدمی کو ایک سیکنڈ کی بھی دیر ہو جاتی تو یہ سمندر میں گر جاتی۔"

وہ اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ اس نے انسپکٹر کا شکریہ بھی ادا نہ کیا اور بچّی کو کھینچتی ہوئی دوسری طرف لے گئی۔ انسپکٹر کی نگاہیں اُس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ خفیہ پولیس کی دس سالہ ملازمت نے اُس میں لوگوں کے چہرے پڑھنے کا ملکہ پیدا کر دیا تھا۔ وہ آہستہ سے مسکرایا۔ اس نے دل ہی دل میں کوئی فیصلہ کر لیا تھا۔

ایک گھنٹے بعد جہاز کراچی کی بندر گاہ پر پہنچ گیا۔ انسپکٹر اس عورت کے پیچھے لگا رہا اور جب وہ کسٹمز آفیسر کے سامنے سامان چیک کرانے کھڑی ہوئی تو انسپکٹر نے آفیسر کو ایک خاص اشارہ کیا جسے عورت نے نہیں دیکھا مگر کسٹمز آفیسر سمجھ گیا۔

"آپ میرے ساتھ آیئے" آفیسر نے عورت سے کہا۔

عورت پہلے کچھ کسمسائی، ہچکچائی پھر اس کے پیچھے ہولی۔ آفیسر اسے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا۔

یہاں آ کر وہ پھٹ پڑی "اس کا کیا مطلب ہے؟ آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟ میں ایک عزّت دار خاتون ہوں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ....."

آفیسر نے بڑی نرمی سے اس کی بات کاٹی "آپ ناراض نہ ہوں۔ مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ اصل میں، کچھ عرصے سے اسمگلروں کا ایک گروہ دوسرے ملکوں سے ہیرے جواہرات پاکستان میں اسمگل کر رہا ہے۔ اس کا ہمیں پکّا پتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے ہم ابھی تک اس گروہ کے کسی آدمی کو

پکڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن ہو سکتا ہے بسم اللہ آپ سے ہوتی—

"کیا بکتے ہو؟" عورت تڑخ کر بولی "تم نے میری توہین کی ہے۔ تمھیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔"

عین اسی وقت کھٹ سے دروازہ کھلا اور انسپکٹر سعید اندر داخل ہوا۔ اس نے کہا "میرا خیال ہے، آپ کو جس چیز کی ضرورت ہے، وہ اس گڑیا کے اندر چھپی ہوئی ہے۔"

کسٹمز آفیسر نے عورت کے ہاتھ سے گڑیا لے لی اور میز کی دراز سے چاقو نکال کر اس کا پیٹ چیرا تو اس میں سے ایک تھیلی نکلی جس کے اندر تین قیمتی ہیرے تھے۔

"میرا خیال صحیح نکلا" انسپکٹر سعید مسکرا کر بولا "گڑیا کے گرنے پر اس خاتون کا منہ فق ہو گیا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے۔ کیوں کہ اتنی سی گڑیا کے لیے کوئی عورت اس قدر پریشان نہیں ہوگی۔"

کسٹمز آفیسر نے فوراً ہی پولیس کو فون کیا، ہیرے کسٹمز والوں نے ضبط کر لیے اور عورت کو پولیس پوچھ گچھ کے لیے اپنے ساتھ لے گئی۔

چند منٹ بعد انسپکٹر سعید اور کسٹمز آفیسر آرام سے بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ انسپکٹر نے کہا "یہ اسمگلروں کا ایک چھوٹا سا گروہ ہے، مگر بلا کا چالاک، عیّار اور مکّار۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ لوگ دو سال سے یہ دھندا کر رہے ہیں اور ان میں سے صرف دو آدمی باہر مال لاتے ہیں۔ ایک تو ہم نے آج پکڑ لیا — دوسرے کو پکڑنا ہے۔"

"کیا وہ بھی کوئی عورت ہے؟" کسٹمز آفیسر نے پوچھا۔

"نہیں" انسپکٹر سوچتے ہوئے بولا "وہ مرد ہے اور لاہور میں رہتا ہے۔ ہمیں اس پر کافی دنوں سے شک ہے۔ لیکن ابھی تک ہم اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت مہیا نہیں کر سکے ہیں، جس کی بنا پر اسے قانون کے شکنجے میں کسا جا سکے۔ خیر، آج میں لاہور جا رہا ہوں۔ دیکھو، کیا ہوتا ہے۔"

لاہور پہنچ کر انسپکٹر سعید نے ان لوگوں کا ریکارڈ دیکھا جو اسمگلنگ کا کاروبار کرتے تھے یا جن پر پولیس کو اس قسم کا شبہ تھا۔ ایک گھنٹے کی دیکھ بھال کے بعد ایک کانسٹیبل کو بھیج کر حامد بلّے کو بلوایا جسے لوگ "ہیروں کا شہزادہ" کہتے تھے۔ یہ شخص ظاہر میں تو قالینوں کا کاروبار کرتا تھا، لیکن پولیس کو یقین تھا کہ یہ ہیرے اسمگل کرتا ہے۔

"دیکھو میاں" حامد بلّا انسپکٹر کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا تو اس نے کہا "ہم نے تمہارے گروہ کے ایک ممبر کو کراچی میں پکڑ لیا ہے۔ تمھیں یہ بات معلوم ہو گئی ہوگی۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ تم اس گروہ کے لیڈر ہو۔ اب تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ آیندہ ایسی حرکتوں سے باز آ جاؤ اور شریفانہ زندگی بسر کرنے کا عہد کرو، ورنہ تمھیں علم ہے کہ کاٹھ کی ہنڈیا بار بار چولہے پر نہیں چڑھتی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں" حامد بلّے نے ہنس کر کہا "ایک دنیا جانتی ہے کہ میں قالینوں کا بیوپاری ہوں اور اس سلسلے میں مجھے باہر کے ملکوں میں بھی جانا پڑتا ہے۔ یہ سفر میں باقاعدہ پاس پورٹ سے کرتا ہوں۔ چھپ کر نہیں کرتا۔ آج تک میرے سامان سے کوئی ایسی چیز نہیں نکلی جو قانون کی زد میں آتی ہو۔ پھر خدا معلوم کیوں آپ کو میرے اوپر شک ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اسمگلنگ کرنے والوں سے میرا کوئی تعلق نہیں اور نہ میں اس عورت کو ہی جانتا ہوں۔" باتیں کرتے وقت اس نے ایک بار بھی آنکھیں نہیں جھپکی تھیں۔ انسپکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بے تکان بولتا رہا تھا۔

"تم بڑے ڈھیٹ ہو" انسپکٹر نے مسکرا کر کہا "خیر بچّو، دیکھوں گا کب تک بچو گے۔ اب تم جا سکتے ہو۔" حامد بلّا مسکراتا ہوا چلا گیا۔

انسپکٹر دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر خیالات میں غرق ہو گیا۔ ہیرے مختلف طریقوں سے اسمگل کیے جاتے ہیں۔ بعض اسمگلر اپنے جوتوں کے تلوں میں انھیں چھپا لیتے ہیں، بعض اس مقصد کے لیے بچّوں کے کھلونے استعمال کرتے ہیں جیسا کہ اس عورت نے کیا تھا۔ لیکن انجام سب کا ایک ہی ہوتا

ہے۔ کسی دن ذرا سی بھول چوک سے پکڑے جاتے ہیں۔

لیکن یہ شخص جسے لوگ ہیروں کا شہزادہ کہتے تھے، بڑا چالاک اور دیدہ دلیر تھا۔ پولیس نے بڑی کوشش کی کہ اس کے پاس سے اسمگل کی ہوئی کوئی چیز نکل آئے مگر ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ بڑے مزے سے بحرین، سعودی عرب اور لیبیا وغیرہ جاتا اور کسٹمز والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر وہاں سے لاکھوں روپے کے ہیرے اسمگل کر کے لے آتا۔

انسپکٹر دیر تک سوچوں میں ڈوبا رہا اور جب اس نے اپنا چہرہ اوپر اُٹھایا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا ہے۔

ایک مہینے کے بعد انسپکٹر سعید پھر اسی جہاز میں بحرین سے وطن واپس آ رہا تھا۔ موسم خوش گوار تھا اور سمندر پُرسکون۔ وہ جنگلے سے لگا خیالوں میں گم تھا کہ پیچھے سے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی "آخاہ انسپکٹر صاحب! آپ یہاں کیسے؟" یہ حامد بِلّا تھا۔

"میں سرکاری کام سے بحرین گیا تھا" انسپکٹر نے جواب دیا۔ اس کی نگاہیں حامد بِلّے کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں "تم اپنی سناؤ۔"

"میں بھی بحرین ہی سے آ رہا ہوں۔ قالینوں کے آرڈر لینے گیا تھا" اس نے جواب دیا "لیکن آپ مجھے اس طرح گھور کیوں رہے ہیں؟"

"یہ میں کراچی پہنچنے پر بتاؤں گا" انسپکٹر نے کہا "میں نے تمہارے راز کا پتا چلا لیا ہے۔"

انسپکٹر نے یوں ہی ہوا میں تیر چلایا تھا، مگر وہ ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ حامد کے چہرے کی رنگت ایک دم بدل گئی۔ لیکن یہ صرف چند سکنڈ کے لیے ہوا۔ اس نے فوراً اپنے آپ پر قابو پا لیا اور بڑی ڈھٹائی سے انسپکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "چلیے، یہ تو بہت اچھا ہوا۔ اب آپ مجھے پکڑ سکیں گے۔ لیجیے، بندرگاہ آ گئی۔"

بیس منٹ بعد حامد بِلّا کراچی کی بندرگاہ پر کسٹمز آفیسر کے سامنے کھڑا اپنا سامان چیک کرا رہا تھا۔ انسپکٹر سعید اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے کسٹمز آفیسر کو ایک خاص اشارہ کیا۔

"کیا میں جا سکتا ہوں؟" کسٹمز آفیسر سامان کی تلاشی لے چکا تو حامد بِلّے نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں" آفیسر نے کہا "تھوڑی دیر کے لیے میرے ساتھ اس کمرے میں چلیے۔"

کمرے میں پہنچ کر حامد نے بڑے اطمینان سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ہنس کر بولا "فرمائیے؟"

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ کھٹ سے دروازہ کھلا اور انسپکٹر سعید اندر داخل ہوا۔ اس نے آتے ہی دائیں ہاتھ سے حامد کو دبوچ لیا اور بائیں ہاتھ سے اُس کی بائیں آنکھ باہر نکال لی۔ وہ شیشے کی آنکھ تھی اور اس کے اندر ایک بہت ہی قیمتی ہیرا رکھا ہوا تھا۔

"کمال ہے؟" حامد بِلّے کو پولیس کے حوالے کرنے کے بعد کسٹمز آفیسر حیرت سے بولا "مجھے تو ساری زندگی یہ گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ شخص کانا ہے اور اس کی ایک آنکھ شیشے کی ہے۔ انسپکٹر صاحب، آپ نے کیسے پتا چلا لیا؟"

"بھئی ہم پولیس والے ہیں۔ اُڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں" انسپکٹر نے ہنس کر کہا "آپ نے یہ غور نہیں کیا کہ یہ شخص جب باتیں کرتا تھا تو صرف دائیں آنکھ ہی جھپکتا تھا۔ بائیں آنکھ کھلی رہتی تھی۔ میں نے غور کیا تو جھٹ سمجھ گیا کہ یہ آنکھ مصنوعی ہے۔"

"واقعی، واقعی" آفیسر سر ہلا کر بولا "آپ اُڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں!"

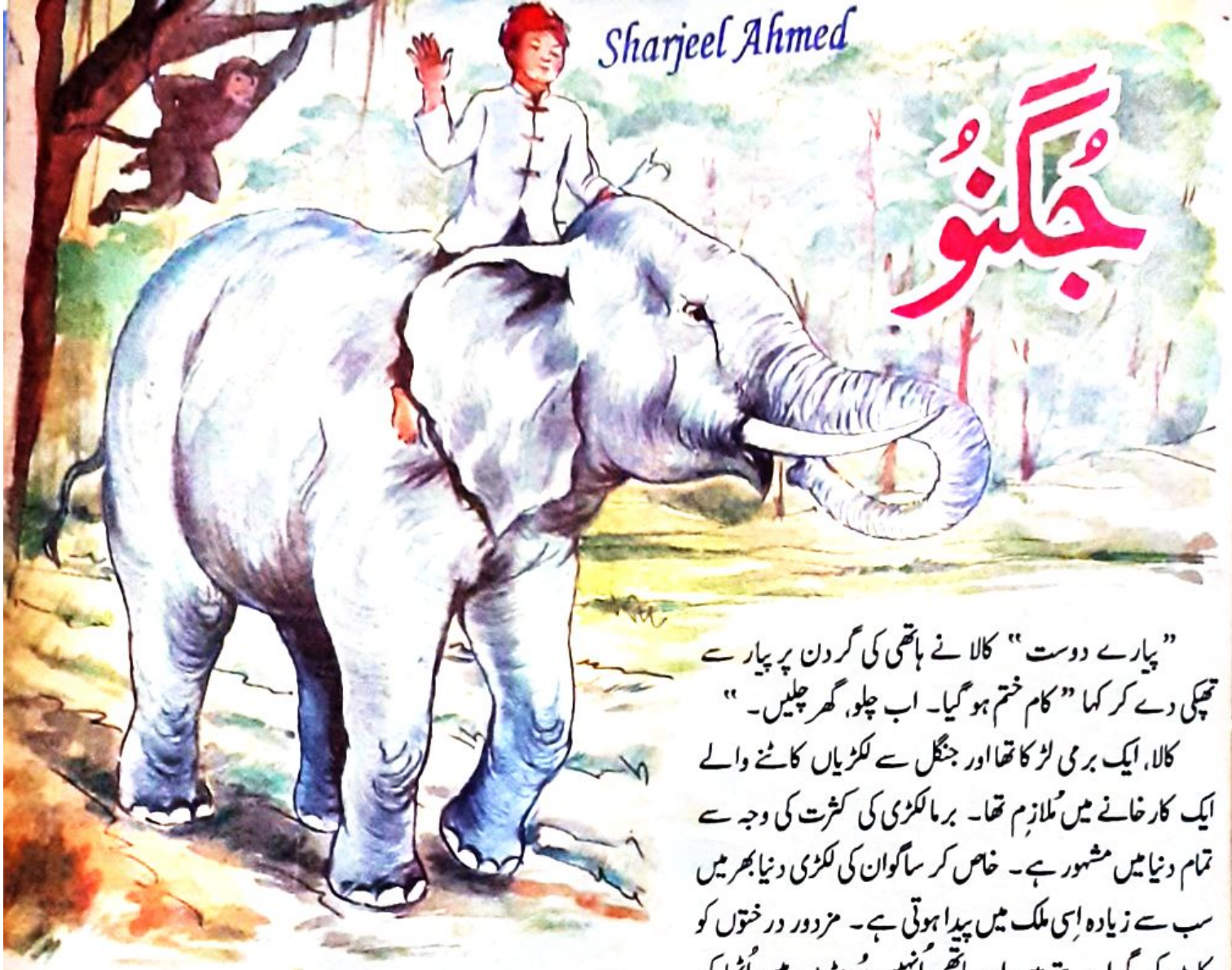

جگنُو

"پیارے دوست" کالا نے ہاتھی کی گردن پر پیار سے تھپکی دے کر کہا "کام ختم ہو گیا۔ اب چلو، گھر چلیں۔"

کالا، ایک برمی لڑکا تھا اور جنگل سے لکڑیاں کاٹنے والے ایک کارخانے میں مُلازِم تھا۔ برما لکڑی کی کثرت کی وجہ سے تمام دنیا میں مشہور ہے۔ خاص کر ساگوان کی لکڑی دنیا بھر میں سب سے زیادہ اِسی ملک میں پیدا ہوتی ہے۔ مزدور درختوں کو کاٹ کر گرا دیتے ہیں اور ہاتھی اُنہیں سُونڈوں میں اُٹھا کر قریب کے دریا میں پھینک دیتے ہیں۔ درختوں کے کٹے ہوئے تنے دریا کے بہاؤ کے ساتھ بہتے ہوئے لکڑی چیرنے کے کارخانوں تک جاتے ہیں، جہاں دریا کے آر پار موٹے موٹے رسّے بندھے ہوتے ہیں۔ اِن رسّوں میں یہ تنے پھنس جاتے ہیں اور کارخانے والے اِنہیں نکال لیتے ہیں۔

ہر کارخانے دار کے پاس چند ہاتھی ہوتے ہیں اور وہ اُن کے لیے مہاوت بھی ملازم رکھتا ہے۔ کالا کا باپ ایک بُہت ہوشیار اور محنتی مہاوت تھا۔ اُس کے مرنے کے بعد کارخانے دار نے کالا کو مُلازم رکھ لیا۔ کالا کی ماں بچپن ہی میں مر چکی تھی اور اب دنیا میں اُس کے صرف دو ہی دوست تھے۔ ایک اُس کا ہاتھی جگنُو اور دُوسرا چمُوّ بندر جو اپنی دلچسپ حرکتوں سے اُس کا دل بہلاتا رہتا۔

شام کا دُھندلکا چھانے لگا تھا۔ دوسرے ہاتھی بان اپنے ہاتھی لے کر گھر چلے گئے تھے۔ کالا نے پیار سے جگنو کی گردن تھپ تھپائی اور بولا "چلو بھئی جگنو۔ اب چل کر آرام کریں۔" اور جگنو ایک فرماں بردار نوکر کی طرح ٹُھمک ٹُھمک کر گھر کی طرف چلنے لگا۔ اُن کے ساتھ چمُوّ بھی درختوں پر اُچھلتا کُودتا، خُوں خُوں کرتا چل رہا تھا۔

جنگل کے سِرے پر فیل خانہ تھا، جہاں تمام ہاتھی جمع ہوتے تھے، اور فیل خانے سے ذرا پرے کارخانے کے مالک کا بنگلا تھا۔ جب تینوں دوست فیل خانے کے قریب پہنچے تو بنگلے سے ڈزن ڈزن گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں اور دو سائے اندر سے نکل کر شام کی تاریکی میں غائب ہو گئے۔ کالا جلدی سے نیچے اُترا اور بھاگتا ہوا بنگلے کے اندر گیا۔ بنگلے کے دروازے کے ساتھ ہی کارخانے کا دفتر تھا۔ دفتر کا دروازہ چوپٹ کھُلا ہُوا تھا اور اندر سے کسی کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ کالا

نے اندر گھس کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ سامنے کی دیوار کے پاس ایک آدمی رسّیوں سے بندھا پڑا تھا۔ یہ کارخانے کا مالک مسٹر مان فون تھا۔ کالا نے جلدی جلدی اُس کی رسّیاں کھولیں اور چیخ کر بولا "جناب! خیر تو ہے؟ یہ ــــ یہ گولیاں کس نے چلائی تھیں اور ....."

مان فون کراہتا ہوا بولا "افسوس! اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ سب کچھ لُوٹ کر لے گئے۔ سب کچھ ــــ"

"کون ــــ؟ کون لے گئے؟" کالا نے بے تابی سے پوچھا۔

فون چند منٹ سانس لینے کے لیے رُکا اور پھر بولا "میں دفتر میں بیٹھا حساب کتاب کر رہا تھا کہ دو آدمی بندوقیں لیے اندر داخل ہوئے اور مجھ سے تجوری کی چابیاں مانگیں۔ میرے اِنکار کرنے پر اُنھوں نے گولیاں مار مار کر تجوری کا تالا توڑ دیا اور مجھے رسّیوں سے جکڑ کر نیچے پھینک گئے اور "

"اور کیا ــــ؟" کالا نے جلدی سے پوچھا۔

"اور وہ تمام روپیہ بھی لے گئے جو کل میں بینک سے مزدوروں کو تنخواہیں دینے کے لیے لایا تھا ــــ اب کیا ہو گا؟ پہلے ہی مجھے کافی نقصان ہو چکا ہے۔ اب میں زیادہ نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے ایک ہاتھی فروخت کرنا پڑے گا" یہ کہہ کر وہ کراہتا ہوا اُٹھا اور بولا "میں شہر جا رہا ہوں، تھانے میں رپٹ کرنے۔ تم صبح کو چن من کے کارخانے میں جا کر اُس کے مالک سے بات چیت کرو۔ اگر وہ جگنو کو مول لینے پر تیار ہو تو مجھے آ کر بتانا۔"

کالا یہ سُن کر اُچھل پڑا جیسے اُس کی پیٹھ میں کسی نے چُھرا بھونک دیا ہو۔ جگنو تو اُس کی زندگی کا ساتھی ہے۔ وہ بھی اُس سے جُدا ہو گیا تو پھر دنیا میں اُس کا کون رہ جائے گا!

وہ ہکّا بکّا کھڑا کمرے کی چھت کو گھور رہا تھا کہ یکایک چونک پڑا۔ چمّو خوں خوں کرتا ہُوا اُس کے کاندھے پر چڑھ گیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں گتّے کا ایک گول سا ٹکڑا تھا۔ کالا نے وہ ٹکڑا اس سے چھین لیا اور اُسے غور سے دیکھا تو حیرت سے اُچھل پڑا۔ گتّے کے ٹکڑے پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے "چن من کمپنی۔" کالا نے چیخ کر کہا "ارے! یہ تو کسی مزدور کا شناختی کارڈ ہے۔ یہ یہاں کیسے آیا؟ آہ! میرے خدا! یہ چن من کمپنی کے کسی مزدور کی شرارت تو نہیں! ابھی چل کر کھوج لگاتا ہوں۔"

کچھ دیر بعد تینوں دوست گھنے جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ اِس جنگل سے پرے دوسرا جنگل تھا اور اس کے کنارے چن من کمپنی کے مزدوروں کی بستی تھی۔ جگنو چُپ چاپ چلا جا رہا تھا کہ ایک دم چلتے چلتے رُک گیا اور سُونڈ اٹھا کر کچھ سُونگھنے لگا۔ کالا تھوڑا سا آگے کو جُھکا اور آہستہ سے بولا "کیا ہے جگنو؟ کیا سونگھ رہے ہو؟" جگنو نے سونڈ اِدھر اُدھر گھُمائی اور پھر کچھ سونگھنے لگا۔

"دھت دھت دھت" کالا نے اُس کے سر پر آہستہ آہستہ ہاتھ مار کر کہا۔ جگنو نے اپنی سُونڈ اونچی کر دی اور کالا اُس کی سونڈ کے ذریعے نیچے اُتر آیا۔ اُس جگہ ڈھلان تھی۔ اور جب وہ آگے بڑھا تو اُس کے پیروں کو نمی محسوس ہوئی اور وہ جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ آگے ایک دل دل تھی اور اس خوفناک دل دل میں ایک آدمی پھنسا ہوا باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے کالا کو دیکھا تو چلّا کر بولا "بھائی! میں مر رہا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے بچاؤ!" مگر کالا اُسے کیسے بچاتا۔ اندر جاتا تو خود بھی پھنس جاتا۔ رسّی بھی پاس نہیں تھی۔

چمّو موقع پا کر ایک درخت پر چڑھ گیا تھا اور اُس کی ڈاڑھیاں پکڑ کر اِدھر اُدھر چھلانگیں لگا رہا تھا۔ اچانک کالا کے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ اُس نے جگنو کو آواز دی اور اُس کے اوپر چڑھ کر درخت کی دو تین لمبی لمبی ڈاڑھیاں کاٹ لیں۔ پھر نیچے اُتر کر انہیں ایک دوسرے کے ساتھ باندھ لیا۔ یہ ایک لمبی سی مضبوط رسّی بن گئی۔ اِس رسّی کا ایک سِرا اُس نے جگنو کے دانت سے باندھا اور دوسرا سِرا دلدل میں پھنسے ہوئے آدمی کی طرف پھینک دیا۔ اُس نے فوراً ہی وہ سرا اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا۔

"کھینچو جگنو! کھینچو!" کالا نے زور سے کہا اور جگنو نے دو منٹ میں اُس آدمی کو دلدل سے باہر کھینچ لیا۔

"میرے مُحسن! میرے بھائی!" اُس آدمی نے کالا کو خوشی سے لپٹاتے ہوئے کہا "تم نے مجھے موت کے بھیانک جبڑوں سے نکالا ہے۔ میں تمہارا کس مُنہ سے شکریہ ادا کروں۔"

"پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم کون ہو اور اس دلدل میں کیسے پھنسے؟" کالا نے پوچھا۔

"میرا نام جوکو ہے" اُس آدمی نے جواب دیا "اور میں چن من کمپنی میں کام کرتا ہوں۔ اِدھر سے گزر رہا تھا کہ اِس دلدل میں پھنس گیا۔" یہ کہ کر اُس نے دم لیا اور بولا "تمہارا نام کیا ہے اور تم کہاں کام کرتے ہو؟"

کالا نے اُسے ساری باتیں بتائیں اور بولا "مجھے یقین ہے کہ چور تمہاری ہی بستی کا کوئی آدمی ہے۔ میرے پاس اِس کا ثبوت موجود ہے۔"

یہ سُن کر جوکو کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ مگر فوراً ہی اُس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور دانت نکوس کر بولا "اگر چور میری بستی کا آدمی ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اُس کو پکڑوانے میں تمہاری مدد کروں گا۔ تم کل شام مجھ سے ملو۔"

"کہاں ــــ؟" کالا نے خوش ہو کر پوچھا۔

جوکو نے تھوڑی دیر کچھ سوچا اور پھر بولا "اُس جنگل سے پرے، جہاں سے ہماری بستی شروع ہوتی ہے۔ اُس کے کنارے پر ساگوان کا ایک بہت اونچا درخت ہے۔ کل تم دن چھپتے ہی وہاں پہنچ جانا۔"

دوسرے دن شام کو کالا اُس ساگوان کے درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ اُس نے جگنو کو کچھ دور ایک دوسرے درخت کے نیچے کھڑا کر دیا تھا تاکہ اُسے کوئی دیکھ نہ لے۔ چمّو بھی جگنو کے ساتھ تھا۔ سورج ڈوبے کافی دیر ہو گئی تھی مگر جوکو ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ ایک دم پیچھے سے کسی نے اُسے دبوچ لیا۔ یہ جوکو تھا! اُس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا جس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ اُس نے کالا کی طرف بندوق چھتیائی مگر جوکو نے اُسے روک دیا اور بولا "یہاں نہیں۔ بندوق کی آواز سُن کر لوگ آ جائیں گے۔ جنگل میں لے چلو۔"

دونوں کالا کو گھسیٹتے ہوئے جنگل کی طرف لے چلے۔ جنگل میں سے گزرتے ہوئے کالا کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی جانور درختوں پر چھلانگیں لگاتا ہُوا اُن کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔

بیچوں بیچ جنگل میں پہنچ کر جوکو اور اس کا ساتھی ٹھہر گئے۔

جوکو بولا "بس، یہ جگہ ٹھیک ہے۔ سوکو! نشانہ لگاؤ۔" اور سوکو نے بندوق اُٹھا کر کاندھے سے لگالی مگر لب لبی دبانے والا ہی تھا کہ درخت کے اُوپر سے کوئی جانور دھم سے اُس کے اُوپر کُودا۔ یہ چمّو تھا۔ اِس ناگہانی آفت سے سوکو کے ہاتھ ہل گئے اور گولی کالا کے لگنے کی بجائے جوکو کا کندھا چھیلتی ہوئی نکل گئی۔ اب ایک ایک منٹ قیمتی تھا۔ کالا سوکو کو دھکّا دے کر وہاں سے بھاگا اور اُس جگہ پہنچا جہاں جگنو کھڑا اُس کا اِنتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چمّو بھی آ گیا اور تینوں دوست دوسرے راستے سے گھر کی طرف چلے۔ اب یہ بات بِالکل صاف تھی کہ جوکو ہی چور تھا۔ کالا سوچ رہا تھا کہ وہ گھر جا کر مالک کو سارا قصّہ بتائے گا اور پھر اُسے ساتھ لا کر اِن چوروں کو پکڑوا دے گا۔ لیکن ایکا ایکی اُس کے دماغ میں ایک اور خیال آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جوکو اُس دلدل کے پاس چوری کا روپیہ چُھپا رہا ہو اور بے خبری میں دلدل میں پھنس گیا ہو۔ یہ خیال آتے ہی اُس نے جگنو کا رُخ دلدل کی طرف موڑ دیا۔

چاروں طرف گھُپ اندھیرا تھا۔ کہیں کہیں چاند کی روشنی درختوں کی شاخوں سے چھَن چھَن کر زمین پر پڑ رہی تھی۔ ابھی وہ دلدل سے کچھ فاصلے پر تھے کہ جگنو ایک دم چلتے چلتے ٹھہر گیا اور سُونڈ اُٹھا کر کچھ سُونگھنے لگا۔ یہ دیکھ کر کالا چُپ چاپ دم سادھ کر بیٹھ گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یکایک دل دل کی طرف سے دو سائے حرکت کرتے نظر آئے۔ یہ جوکو اور اُس کا ساتھی سوکو تھا۔ جوکو کے کندھے پر ایک تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ کالا نے جگنو کو پگڈنڈی سے ہٹا کر ایک طرف کھڑا کر دیا تاکہ وہ اُسے دیکھ نہ سکیں اور جب وہ اُس کے قریب سے گزرے تو اُس نے ایک دم جوکو پر چھلانگ لگا دی۔ سوکو اُسے چھُڑانے کے لیے لپکا تو جگنو نے اُسے سُونڈ میں جکڑ کر اِتنی زور سے پٹخا کہ ہڈّی پسلی ایک ہو گئی۔ اب وہ جوکو کی طرف بڑھا اور اُسے بھی سونڈ میں جکڑ کر درخت کی جڑ سے دے مارا۔ دونوں چور بے ہوش ہو کر لمبے لمبے لیٹ گئے۔

کالا روپے کا تھیلا اٹھا کر بھاگم بھاگ گھر گیا اور اپنے دوسرے ساتھیوں کو بُلا لایا۔ جوکو اور سوکو ابھی تک بے ہوش پڑے تھے۔ سب نے مِل کر اُن کی مُشکیں کسیں اور پولیس کے حوالے کر دیا۔ مان فون کالا کے اِس کارنامے سے اِتنا خوش ہُوا کہ اُسے تمام مہاوتوں کا جمع دار بنا دیا اور دو سو روپے نقد اِنعام بھی دیا۔

کالا نے پیار سے جگنو کی سُونڈ سہلائی اور بولا "پیارے دوست! یہ سب تمہاری مہربانی کا نتیجہ ہے۔" چمّو خُوں خُوں کر کے اُس کے کاندھے پر آ چڑھا جیسے کہہ رہا ہو "اور میری نہیں؟" کالا نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہنس کر بولا "اور تمہاری بھی ــــ" (س ۔ ل)

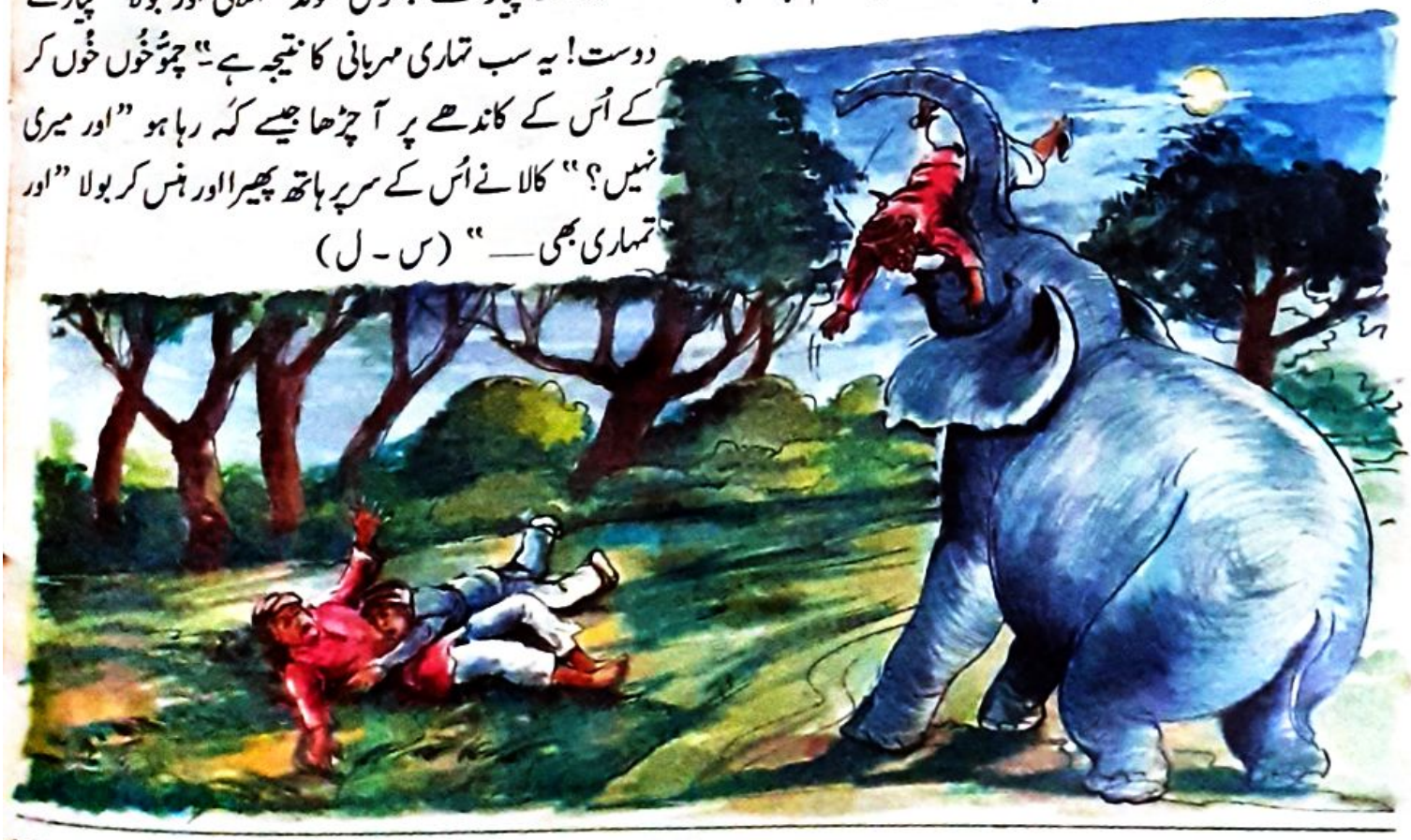

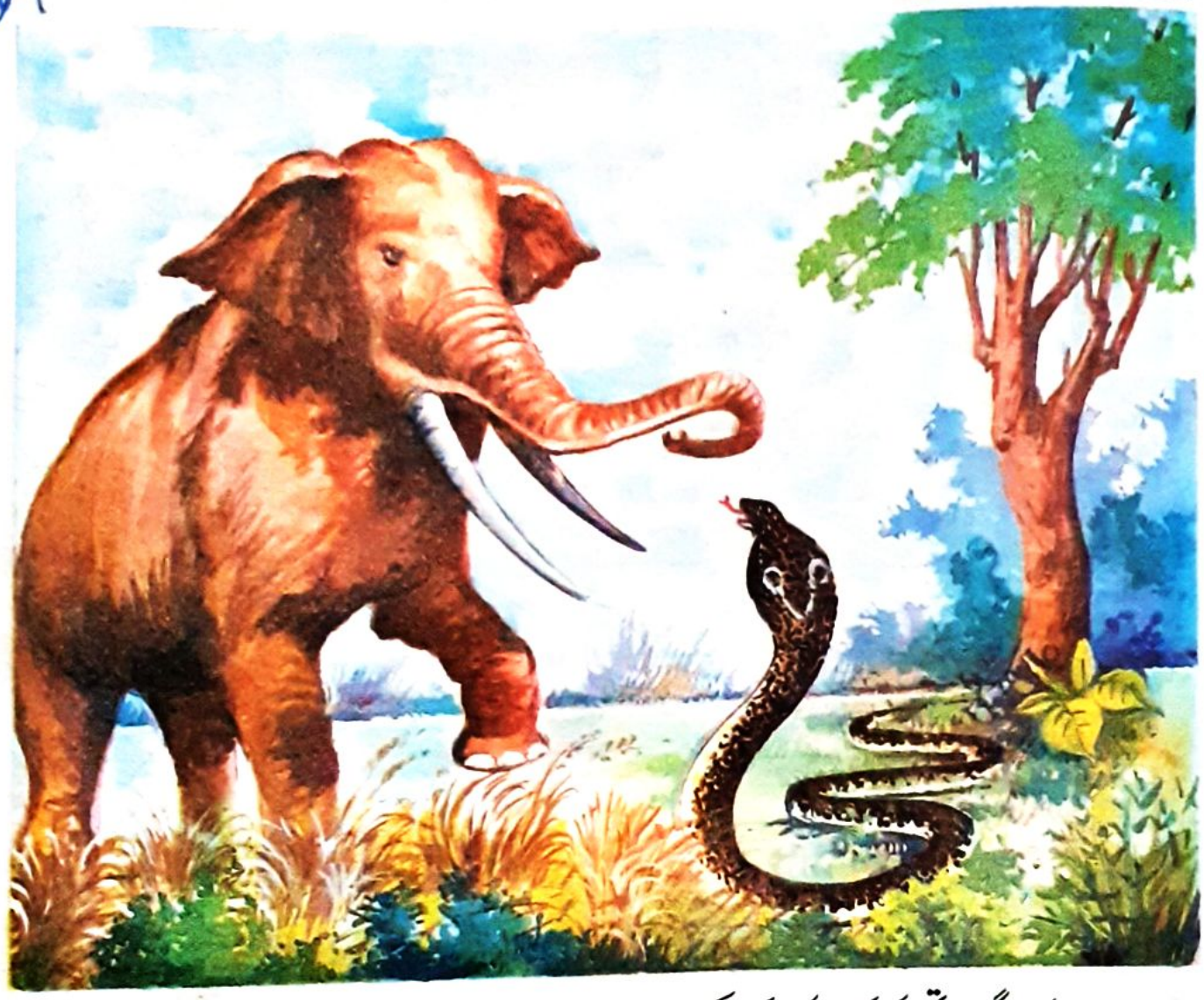

کالا ناگ ہاتھی کو بھی ہلاک کر سکتا ہے

کالا ناگ جنُوب مشرقی ایشیا میں پائے جانے والے تمام سانپوں سے زیادہ زہریلا اور خطرناک سانپ ہے۔ اِس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ یہ 18 فٹ تک لمبا ہوتا ہے اور اِس کی زہر کی تھیلیاں بھی بہُت بڑی ہوتی ہیں۔ بہُت غصّیلا اور غضب ناک سانپ ہے۔ خطرے کی بُو سونگھتے ہی بھڑک اُٹھتا ہے اور دشمن پر اِس پُھرتی سے حملہ کرتا ہے کہ اُسے سنبھلنے تک کا موقع نہیں ملتا۔

جوان ناگ پانچ فٹ اُونچا کھڑا ہو جاتا ہے اور اس وقت پھَن پھیلا کر، جھوم جھوم کر، پُھنکارتا ہے تو بڑے بڑے بہادروں کا پتّا پانی ہو جاتا ہے۔ جنگل کے تمام جانور اِس سے ڈرتے ہیں، حتّٰی کہ ہاتھی بھی اِسے دیکھتے ہی بھاگ اُٹھتا ہے۔ ہاتھی کی سونڈ کے اندر اور ناخنوں کے درمیان کی کھال بہُت پتلی اور نرم ہوتی ہے۔ ناگ اِن جگہوں پر ڈَس لے تو ہاتھی چند منٹ میں تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے۔

چیکو سلواکیہ کی لوک کہانی

ملاّح اور مکھّی

ایک ملاّح سمندر میں ڈوب رہا تھا۔ تیرتے تیرتے آدھا دن گزر گیا تھا' کنارہ نظر نہ آرہا تھا۔ طاقت جواب دے گئی تھی۔ زندگی سے مایُوس ہوگیا تھا۔ قریب تھا کہ ہِمّت ہار کر' اپنے آپ کو موجوں کے حوالے کردے کہ ایک مکھّی دِکھائی دی جو' اُسی کی طرح' سمندر میں ڈوب رہی تھی۔

وہ اُس کی طرف دیکھ کر افسُردگی سے مسکرایا اور بولا "میں ایک آدمی اور تُم ایک مکھّی ---- ہم دونوں کا انجام ایک جیسا ہو گا۔"

دونوں سمندر کی بپھری ہوئی موجوں سے لڑتے رہے۔ پھر ملاّح نے سوچا "میرے بچنے کی تو کوئی اُمّید نہیں۔ آج نہیں تو کل مرجاؤں گا۔ اِس بے چاری مکھّی کو مرنا نہیں چاہیئے۔" اُس نے مکھّی کو اپنے سر پر بٹھالیا۔ چند لمحوں بعد' سورج کی گرم شُعاعوں نے مکھّی کے بھیگے ہوئے پروں کو خشک کردیا اور وہ اُڑ گئی۔

مکھّی تھوڑی دُور گئی تھی کہ اُسے ایک مچھیرے کی کشتی دکھائی دی۔ سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اِس لِیے ملاّح کو کشتی نظر نہ آئی تھی۔ مچھیرا بھی اُسے نہ دیکھ سکا تھا۔ مکھّی اُڑتی ہوئی کشتی کے پاس گئی اور مچھیرے کے کان پر بھِن بھِنانے لگی' جیسے کہہ رہی ہو "مدد! مدد! کوئی ڈوب رہا ہے! بچاؤ! بچاؤ!"

مچھیرے نے ہاتھ ہلا کر مکھّی کو بھگانا چاہا' مگر اُس نے پیچھا نہ چھوڑا۔ بار بار اُس کے کان پر بھِن بھِناتی' اور پھر اُس طرف اُڑ کر جاتی جدھر ملاّح ڈوب رہا تھا۔ اب مچھیرے کو غصّہ آگیا۔ اُس نے سوچا' اِس مکھّی کو مار دینا چاہیئے۔ وہ اُس کے پیچھے کشتی چلانے لگا' اور وہ اُڑتی ہوئی اُس جگہ پہنچ گئی جہاں ملاّح ڈوب رہا تھا۔ مچھیرے نے ملاّح کا ہاتھ پکڑ کر اُسے کشتی میں کھینچ لیا۔

ساحِل پر اُتر کر ملاّح نے گہری لمبی سانس لی اور بولا "حیرت کی بات ہے! میں ایک آدمی اور وہ ایک مکھّی ---- دونوں نے ایک دوسرے کی جان بچائی!" (س۔ ل)

تعلیم و تربیت

یہ واقعہ..... سچا واقعہ..... آج سے 25 سال پہلے مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) کے اس مشہور جنگل میں پیش آیا، جسے سندربن کہتے ہیں۔ اس جنگل میں ہرن، بارہ سنگے، تیندوے، شیر اور چیتوں کے علاوہ ہاتھی بھی پائے جاتے ہیں۔ چوں کہ جنگل کی لکڑی سے حکومت کو کروڑوں روپے کی آمدنی ہوتی تھی، اس لیے حکومت کا محکمۂ جنگلات ہر وقت چوکس رہتا تھا کہ جنگل کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔

اب ہماری کہانی شروع ہوتی ہے۔

اس سال بارشیں بالکل نہیں ہوئی تھیں۔ گرمی بلا کی تھی۔ ندی، نالے، دریا، تالاب سوکھے پڑے تھے۔ کسانوں کی امید بھری نظریں آسمان کی طرف اٹھتیں اور مایوس ہو کر پلٹ آتیں۔ ان کے دل کہہ رہے تھے کہ بارش نہ ہوئی تو کھیتوں میں ایک دانہ بھی نہ اگے گا اور پھر سال بھر تک وہ اور ان کے بال بچے بھوک سے بلکیں گے۔

بارش نہ ہونے سے انسان ہی نہیں، جنگل کے حیوان بھی پریشان تھے۔ وہ تالاب اور ندیاں جو پہلے پانی سے بھری رہتی تھیں اور ان سے سارا جنگل اپنی پیاس بجھاتا تھا، اب ان میں سوائے کیچڑ اور دل دل سے ہونٹ لگا کر تھوڑی بہت نمی چوس لیتے تھے۔ مشکل ہاتھیوں کی تھی، جن کے لیے منوں پانی چاہیے۔ پینے کے لیے بھی اور نہانے کے لیے بھی۔

جب گرمی تڑاخے کی پڑے، بارش نہ ہو اور ہوا زور کی چلے تو ٹہنیوں کی رگڑ سے سوکھے درختوں اور جھاڑیوں میں آگ لگ جاتی ہے۔ اور ایک دفعہ جنگل میں آگ بھڑک اٹھے تو آناً فاناً سارے جنگل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور آن کی آن میں تمام جنگل جل بھن کر کوئلا ہو جاتا ہے۔

اس سال چوں کہ موسم خشک تھا اور جھکڑ چل رہے تھے، اس لیے جنگل میں آگ لگنے کا اندیشہ تھا۔ محکمۂ جنگلات نے اپنے افسروں کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے ماتحت ملازموں کے ساتھ جنگل کے مختلف حصوں میں کیمپ لگائیں اور جہاں کہیں آگ بھڑکے، فوراً بجھا دیں۔ ان افسروں میں ابو القاسم نام کا ایک نوجوان بھی تھا۔ لمبا تڑنگا، گٹھے ہوئے جسم کا، خوب صورت نوجوان۔

ابو القاسم نے اپنا کیمپ جنگل کے جس حصے میں لگایا تھا، وہاں ہاتھی رہتے تھے۔ اس کے ساتھ بیس پچیس آدمی تھے، جنہیں آگ بجھانے کا کافی تجربہ تھا۔ انہیں ہر وقت جنگل میں رہنا پڑتا تھا۔ اس لیے وہ بیوی بچوں کو بھی اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے۔ یہ لوگ ہر روز نئی جگہ کیمپ لگاتے اور گھوم پھر کر دیکھتے کہ کہیں آگ تو نہیں لگی۔

ایک دن ابو القاسم نے اپنا کیمپ ایک تالاب کے کنارے لگایا۔ یہ تالاب دوسرے تالابوں کی طرح بالکل خشک نہیں ہوا تھا۔

آس پاس کے گھنے درختوں کی وجہ سے اس میں تھوڑا سا پانی تھا اور اس کے کناروں پر ہاتھی کے پاؤں کے نشانات تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں ہاتھی پانی پینے آتے ہیں۔کیمپ کے لوگ یہ نشانات دیکھ کر بڑے گھبرائے۔ مگر ابو القاسم نے انہیں تسلی دی کہ صرف دو تین روز ہی یہاں ٹھہرنا ہے۔ پھر کسی جگہ کیمپ لگا لیں گے۔ اس کے دم دلاسے سے ان لوگوں کی کچھ ہمت بندھی۔ ابو القاسم کو معلوم تھا کہ جس جگہ انسان ہوں، وہاں ہاتھی نہیں آیا کرتے۔ وہ تالاب کے کنارے کیمپ لگا دیکھیں گے تو ادھر کا رخ نہ کریں گے اور کوئی دوسرا تالاب تلاش کریں گے۔

ابو القاسم کو محکمے کی جانب سے ایک خدمت گار ملا ہوا تھا، جو چپراسی کا کام بھی کرتا اور باورچی کا بھی۔ اس کے بیوی بچے بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس کا نام فضل حق تھا۔ سانولے رنگ کا، خوب موٹا تازہ۔ سفید براق وردی پہن کر وہ ابوالقاسم کے دفتر کے باہر مونڈھے پر بیٹھتا تو چھوٹے موٹے لوگ اسے جھک جھک کر سلام کرتے اور اسے چھوٹا صاحب کہا کرتے۔ اسے محکمہ جنگلات میں نوکری کرتے بیس برس ہو گئے تھے اور ان بیس برسوں میں اس نے پانچ افسروں کی خدمت کی تھی۔ ابو القاسم چھٹا افسر تھا، جسے اس محکمے میں ملازم ہوئے صرف چھ مہینے ہوئے تھے۔

ابھی انہیں یہاں کیمپ لگائے ایک دن بھی نہ گزرا تھا کہ شام کے وقت ایک چوکی دار بھاگا ہوا آیا۔ اس نے اطلاع دی کہ ایک میل دور، شمال کی جانب جھاڑیوں میں آگ لگ گئی ہے۔ ابو القاسم نے اپنے آدمیوں کو تیاری کا حکم دیا اور آگ بجھانے کا سامان لے کر اس جگہ پہنچ گیا۔ بڑے زور کا جھکڑ چل رہا تھا اور آگ لمحہ بہ لمحہ پھیلتی جا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر ابو القاسم شعلوں میں کود پڑا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی اپنی جان ہتھیلی پر رکھی اور رات بھر کی جدوجہد کے بعد وہ آگ بجھانے میں کام یاب ہو گئے۔ صبح کو ابو القاسم نے اپنے آدمیوں کی گنتی کی تو معلوم ہوا فضل حق ان کے ساتھ نہیں آیا ہے۔

دن چڑھے یہ لوگ گرتے پڑتے واپس کیمپ میں آئے۔ تھکے ہارے، نیند سے بوجھل اور بھوک سے بے تاب کیمپ کے باہر فضل حق نئی دھلی ہوئی سفید براق وردی پہنے بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھا تھا۔ ابو القاسم کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ گرج کر بولا:

''میں نے حکم دیا تھا کہ کیمپ کا ہر شخص میرے ساتھ چلے۔ تم نے میرا حکم کیوں نہیں مانا؟''

''آگ بجھانا میرا کام نہیں۔'' فضل حق نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''میں آپ کا خدمت گار ہوں۔''

''تمہیں ہر کام کرنا پڑے گا۔'' ابو القاسم اور زور سے گرجا۔ ''ورنہ کوئی اور ٹھکانا تلاش کر لو۔'' یہ کہہ کر وہ غصے سے پیر پٹختا خیمے میں چلا گیا۔

فضل حق نے اپنی نئی دھلی ہوئی خوب صورت وردی کو دیکھا۔ اب شاید وہ اسے کبھی نہ پہن سکے۔ محکمہ جنگلات میں نوکری کرتے اسے بیس برس ہو گئے تھے اور اب چند سال بعد پنشن ملنے والی تھی۔ مگر اب اس کی پنشن بھی خطرے میں تھی۔ ابو القاسم کے ذرا سے اشارے پر اسے ملازمت سے جواب مل سکتا تھا، پھر وہ کیا کرے گا؟ بیوی بچوں کو لے کر کہاں جائے گا؟

یہ سوچتے سوچتے اسے ایک بات یاد آئی۔ دو تین مہینے پہلے کی بات جب وہ ابو القاسم کے ساتھ مرغابیوں کے شکار پر گیا تھا تو اس نے ابو القاسم کی بندوق ریتلی زمین پر رکھ دی تھی۔ اس پر ابو القاسم بہت خفا ہوا تھا اور اس نے کہا تھا۔ ''بندوق زمین پر نہیں رکھنی چاہیے۔ اس کی نال میں مٹی بھر گئی تو چلاتے وقت مٹی کی رگڑ سے وہ پھٹ جائے گی اور میرے پرخچے اڑ جائیں گے۔'' یہ بات یاد کر کے فضل حق کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

اسی دن آدھی رات کو جب سارا کیمپ سویا پڑا تھا، فضل چپکے سے ابو القاسم کے خیمے میں داخل ہوا۔ ابو القاسم کے پاس دو

بندوقیں اور دو پستول تھے۔ فضل نے ایک ایک کر کے چاروں ہتھیار اٹھائے اور پھر وہیں رکھ کر دبے پاؤں باہر نکل آیا۔

جنگل کے ہاتھیوں نے ایک دن تو صبر کیا اور کیمپ لگا دیکھ کر تالاب کے پاس تک نہ پھٹکے لیکن دوسرے دن جب مارے پیاس کے ان کی انتڑیاں خشک ہونے لگیں تو وہ بے چین ہو گئے۔ ان میں ایک ہاتھی بڑا گراں ڈیل، طاقت ور اور خوف ناک تھا۔ دوسرے ہاتھی تو پانی کی تلاش میں ادھر ادھر نکل گئے لیکن وہ جھومتا جھامتا اس تالاب کی طرف بڑھا جس کے کنارے ابو القاسم کا کیمپ لگا تھا۔

صبح کے آٹھ بجے تھے۔ ابو القاسم خیمے میں بیٹھا ناشتا کر رہا تھا کہ ایک آدمی نے آ کر خبر دی کہ ایک بڑا ہی خوف ناک ہاتھی تالاب کی طرف آ رہا ہے۔ ابو القاسم نے جلدی سے بندوق بھری، دس بارہ کارتوس جیب میں ڈالے اور باہر نکل آیا۔ کیمپ میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ مرد درختوں پر چڑھ گئے تھے اور عورتیں بچوں کو لے کر جھاڑیوں میں چھپ گئی تھیں۔

ابو القاسم ایک درخت کی آڑ لے کر کھڑا ہو گیا۔ ایک منٹ، دو منٹ، تین منٹ اور پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے زمین ہل رہی ہے۔ جیسے بھونچال آ رہا ہے۔ اس نے درخت کی آڑ سے جھانک کر دیکھا۔ ایک پہاڑ سا ہاتھی چنگھاڑتا ہوا تالاب کی طرف آ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کئی دن کا پیاسا ہے۔ اس نے دائیں دیکھا نہ بائیں، سیدھا تالاب میں گھس گیا اور سونڈ بھر بھر کر پانی پینے لگا۔

''مارو صاحب مارو۔'' درخت کے اوپر سے کسی نے کہا۔

ابو القاسم نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ فضل حق ایک شاخ پر سہما بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

''مارو صاحب، مارو جلدی کرو۔'' فضل نے دوبارہ کہا۔

لیکن ابو القاسم قدرت کے اتنے بڑے عجوبے کو خواہ مخواہ مارنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چپ چاپ بت بنا کھڑا رہا مگر اس کی انگلی بندوق کی لب لبی پر تھی اور اس کی ہلکی سی جنبش اس دیو جیسے ہاتھی کو خاک و خون میں لٹا سکتی تھی۔

ہاتھی نے پہلے خوب پیٹ بھر کے پانی پیا۔ پھر سونڈ میں پانی بھر بھر کے نہانے لگا۔ جب اس کا سارا جسم تر بتر ہو گیا تو وہ خوشی سے چنگھاڑا اور جنگل کی طرف جانے کے لیے مڑا۔

''کیا کرتے ہو صاحب؟'' فضل نے چیخ کر کہا۔ ''گولی کیوں نہیں چلاتے؟'' اور تب ایک ننھا سا بچہ، ایکا ایکی پاس کی جھاڑی سے نکلا اور ''ہاتھی آیا، ہاتھی آیا۔'' کہتا ہوا اس خوف ناک ہاتھی کی طرف دوڑنے لگا۔ بچے کو دیکھ کر ہاتھی نے سونڈ اوپر اٹھائی اور آگے پیچھے اس طرح جھولا جیسے بس حملہ کرنے ہی والا ہے۔

یہ بڑا نازک وقت تھا۔ ابو القاسم کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا

کرے؟ اگر گولی چلاتا ہے تو ہاتھی زخمی ہو کر غضب ناک ہو جائے گا۔ وہ سمجھے گا کہ اس کی تکلیف کی وجہ یہی بچہ ہے۔ وہ اسے پیروں تلے کچل دے گا۔ اتنے بڑے ہاتھی کو مارنے کے لیے کم از کم پانچ چھ گولیاں چاہئیں۔ اور جب تک وہ دوبارہ بندوق بھرے گا، ہاتھی بچے کی ہڈیوں کا سرمہ بنا چکا ہوگا۔

بچہ ہاتھی سے پچاس ساٹھ قدم دور رہ گیا تھا۔ ابو القاسم نے بندوق پھینک دی اور پوری رفتار سے بچے کی طرف دوڑا۔ اس نے پھرتی سے بچے کو گود میں اٹھایا اور بجلی کی سی تیزی سے درخت کے پاس واپس آ گیا۔ ہاتھی ہکا بکا کھڑا یہ تماشا دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک ہول ناک چیخ ماری اور گھنے جنگل میں غائب ہو گیا۔

تمام لوگ درختوں سے کود پڑے۔ مائیں بچوں کو لے کر جھاڑیوں میں سے نکل آئیں۔ ابو القاسم نے ماتھے سے پسینا پونچھا اور بچے کو زمین پر کھڑا کر کے بولا۔ ''یہ کس کا بچہ ہے؟''

''میرا جناب۔'' پیچھے سے آواز آئی۔

ابو القاسم نے مڑ کر دیکھا۔ یہ فضل حق تھا۔ اس کا خدمت گار۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا، آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور چہرے کی جھریاں لرز رہی تھیں۔

''اکیلا کیوں چھوڑ دیا تھا اسے؟'' ابو القاسم نے اسے ڈانٹا۔

''چھوٹا بچہ رو رہا تھا۔'' فضل کی بیوی نے کہا۔ ''میں اسے خاموش کرانے لگی تو یہ موقع پا کر بھاگ نکلا۔''

''صاحب!'' فضل کپ کپاتی آواز میں بولا۔ ''میں بہت شرمندہ ہوں۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دیجئے۔''

ابو القاسم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''قصور تمہارا نہیں، تمہاری بیوی کا ہے۔''

''میں اس بات کی معافی نہیں مانگ رہا، حضور۔'' فضل نے آہستہ سے کہا۔ ''یہ دیکھیے.....''

اس نے ابو القاسم کی بندوق اٹھائی اور اس کی نال نیچے کی تو اس میں سے مٹھی بھر مٹی نکل کر زمین پر گر پڑی۔

''اف! میرے اللہ!'' ابو القاسم نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا تم..... تم..... مجھے مارنا چاہتے تھے؟''

''جی ہاں.....'' فضل سر جھکا کر بولا۔ ''آپ نے مجھے نوکری سے نکالنے کی دھمکی دی تھی۔ اس لیے میں آپ سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے فائر نہیں کیا.....''

یہ کہہ کر وہ گھٹنوں کے بل جھکا اور ابو القاسم کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ''کہہ دیجئے کہ میں نے تجھے معاف کیا۔ میں گناہ گار ہوں۔ میں قصور وار ہوں۔''

روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی اور آنکھوں سے آنسوؤں کی ایسی جھڑی لگی کہ ابو القاسم کا ہاتھ تر بتر ہو گیا۔ اس نے فضل کا کاندھا تھپ تھپایا اور بڑی نرمی سے بولا۔ ''اٹھو فضل، اٹھو۔ میں نے تمہیں معاف کیا۔ خدا بھی تمہیں معاف کرے۔''

اچانک ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ مشرق کی طرف سے گھن گھور گھٹا جھوم کر اٹھی۔ کیمپ والوں کے دل مسرت سے کھل اٹھے اور وہ امید بھری نظروں سے امنڈتے گمنڈتے کالے سیاہ بادلوں کو دیکھنے لگے۔

''یہ گھٹا ضرور برسے گی۔'' ان کے دل کہہ رہے تھے۔

☆☆☆

سیب قدرتی ٹوتھ برش

سیب اپنی خصوصیات یعنی نرمی، ملائمت، ہلکی تیزابیت اور دھاری دار چھلکوں کی وجہ سے چھوٹوں اور بڑوں کا پسندیدہ پھل ہے۔ یہ پھل دنیا کے بیشتر ممالک میں پایا جاتا ہے۔ فولاد سے بھرپور اس پھل کے بارے میں ماہرین نے انکشاف کیا ہے کہ ان سب خصوصیات کے علاوہ سب ہمارے دانتوں کی صفائی کے لیے قدرتی ٹوتھ برش کا کام بھی کرتا ہے۔ مشہور انگریزی کہاوت ہے کہ: An Apple a day keep doctors away

مرمری (crunchy) غذائیں جن میں سیب کے علاوہ شلجم اور گاجر وغیرہ شامل ہیں کہ جب ہم چباتے ہیں تو یہ ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر ننھے ننھے ٹوتھ برش کے طور پر ہمارے دانتوں کی صفائی کرتے ہیں۔ اچھی طرح چبانے کے دوران یہ غذائیں جن میں سیب اپنے دھاری دار چھلکوں کی وجہ سے سرفہرست ہے آہستہ آہستہ دانتوں کے داغ دھبے مٹاتی ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر آپ روزانہ کافی پیتے ہیں اور سیب نہیں کھاتے تو کافی کی وجہ سے دانتوں پر داغ دھبے جمع ہو جاتے ہیں لیکن اگر کافی پینے والے روزانہ ایک سیب کھائیں تو رفتہ رفتہ کافی کے داغ دھبے صاف ہونے لگیں گے۔

بچو! اگر آپ آج ہی سے کھانے کے بعد سیب کا استعمال شروع کر دیتے ہیں تو آپ خود محسوس کریں گے کہ آپ کے دانتوں پر موجود میل اور داغ دھبے چند ہی دنوں میں صاف ہو جائیں گے اور آپ کے دانتوں کی تہہ (Enamel) مضبوط ہو جائے گی۔ (مصباح صدف مبشر، جھنگ)

Sharjeel Ahmed

بُڑھیا کا شوربا

ہزار سال پہلے چین دس سلطنتوں میں بٹا ہوا تھا اور ان دس سلطنتوں پر پانچ خاندان حکومت کرتے تھے۔ یہ دسوں ملک آپس میں لڑتے رہتے تھے اور کوئی مہینا ہی ایسا جاتا ہوگا جب ان ملکوں کی رعایا کو سکھ چین نصیب ہوتا ہو۔ ایک لڑائی ختم ہوتی تو چند روز بعد دوسری شروع ہو جاتی، جس میں شہر کے شہر تباہ ہو جاتے اور ہزاروں بے گناہ لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ فاتح بادشاہ ہارنے والے بادشاہ کے ملک پر قبضہ کر لیتا اور ہارا ہوا بادشاہ یا تو اپنا سر اور تخت دونوں گنوا بیٹھتا یا پھر جان بچا کر گھنے جنگلوں اور ویران پہاڑوں کی طرف بھاگ جاتا۔

یہ انہی دنوں کا قصہ ہے۔ چین کے ان دس ملکوں میں سے ایک ملک پر سانگ خاندان کا ایک بہادر اور عقل مند بادشاہ، جاؤ کوانگ، حکومت کرتا تھا۔ اس کی پڑوسی ملکوں کے ساتھ آئے دن لڑائی رہتی تھی، جن میں اکثر وہی کام یاب ہوتا تھا لیکن ایک دفعہ ایسا ہوا کہ دو تین ملکوں نے مل کر اس پر حملہ کر دیا۔ اس نے خوب ڈٹ کر حملہ آوروں کا مقابلہ کیا مگر دشمنوں کی فوجیں بہت زیادہ تھیں۔ جاؤ کوانگ کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ جاؤ نے اپنی فوج کو بھاگتے دیکھا تو اس نے بھی اپنے گھوڑے کی باگ موڑ دی اور جنگل کی طرف فرار ہو گیا۔

وہ تین دن اور تین راتیں، بھوکا پیاسا، غاروں اور پہاڑیوں میں چھپتا پھرا اور جب تھکن اور بھوک سے بالکل نڈھال ہو گیا تو ایک ٹیلے کے پاس بے سدھ ہو کر گر پڑا اور موت کا انتظار کرنے لگا۔ عین اسی وقت شمال کی طرف سے ٹھنڈی ہوا کا ایک خوش بو دار جھونکا آیا۔ جاؤ کوانگ نے مُندی ہوئی آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اتنے میں ویسا ہی ایک اور خوش بو دار جھونکا آیا اور وہ بے تاب ہو کر اُٹھ بیٹھا۔ ہوا کے ان جھونکوں میں گرم گرم کھانے کی خوش بو رچی ہوئی تھی۔ لگتا تھا ٹیلے کی دوسری جانب کوئی شخص مزے دار کھانا پکا رہا ہے۔

جاؤ کوانگ نے جسم کی تمام طاقت ٹانگوں میں جمع کی اور گرتا پڑتا ٹیلے کی دوسری طرف پہنچا۔ یہاں گھنے درختوں کے پاس ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی تھی اور اس جھونپڑی کے باہر ایک بڑھیا بیٹھی ہنڈیا میں کچھ پکا رہی تھی۔ ہوا میں رچی ہوئی خوش بو اسی پکوان کی تھی۔

جاؤ بڑھیا کے پاس گیا اور بڑی مشکل سے اٹک اٹک کر بولا۔

''بڑی بی.....''

بڑھیا نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا، اس کے میلے جیکٹ، پھٹے ہوئے، کپڑوں کو دیکھا، پچکے ہوئے گالوں کو دیکھا، گالوں پر بڑھی

ہوئی ڈاڑھی کو دیکھا کپ کپاتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا اور اُن ہونٹوں کو دیکھا، جن پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور وہ سب کچھ سمجھ گئی۔

اس نے کچھ کہے بغیر ہانڈی میں ڈوئی گھمائی، پیالے میں شوربا ڈالا اور جاؤ کوانگ کے لرزتے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اس نے ایک ہی گھونٹ میں اسے خالی کر دیا۔ بڑھیا نے دوبارہ پیالے میں شوربا بھرا اور جاؤ اسے بھی غٹا غٹ پی گیا اور پھر پیالے کے پیندے میں پڑے ہوئے مٹر اور لوبیے کے دانے چبانے لگا۔ اب اس کے تنِ مردہ میں کچھ جان آ گئی تھی۔ اس نے گہری سانس لی، آستین سے منہ صاف کیا اور بڑھیا سے پوچھا۔ ''یہ کون سا پکوان ہے، ماں جی؟ ایسا لذیذ اور خوش ذائقہ کھانا میں نے زندگی میں کبھی نہیں کھایا۔''

''یہ مٹر اور لوبیے کا شوربا ہے، بیٹے۔'' بڑھیا نے جواب دیا۔ ''میں بہت غریب عورت ہوں۔ اس سے بہتر کھانا مجھے میسر نہیں۔''

اب اس واقعے کو کئی سال گزر گئے تھے۔ جاؤ کوانگ نے آس پاس کے گاؤں اور قصبوں سے نئی فوج بھرتی کی تھی اور دشمنوں سے لڑ بھڑ کر اپنی سلطنت دوبارہ حاصل کر لی تھی۔ اب وہ بہت طاقت ور اور بہت دولت مند بادشاہ تھا۔ اسے دنیا جہان کی تمام نعمتیں میسر تھیں۔ شاہی باورچی خانے میں بیسیوں باورچی تھے جو اس کے لیے اعلیٰ اعلیٰ کھانے تیار کرتے تھے۔ دُنیا کا کوئی پکوان ایسا نہ تھا جو اس کی میز کی زینت نہ بنتا ہو۔

لیکن ایک دن ایسا ہوا کہ وہ ان تمام پکوانوں سے بے زار ہو گیا۔ اسے بڑھیا سے بڑھیا اور لذیذ سے لذیذ کھانے بھی بے مزہ معلوم ہوتے۔ وزیر حیران تھے اور باورچی پریشان۔ بادشاہ کو کوئی کھانا ہی پسند نہ آتا تھا۔

ایک دن جاؤ کوانگ کھانے کی میز پر بیٹھا تو اسے وہ بڑھیا یاد آئی۔ وہی جس نے جنگل میں اسے سبزی کا شوربا پلایا تھا۔ آہا! کتنا لذیذ اور مزے دار تھا وہ شوربا! میں نے تو کہا تھا کہ میں اسے کبھی نہیں بھولوں گا، پھر کیوں بھول گیا؟ اس نے اسی وقت شاہی باورچیوں کو بلایا اور ان سے کہا۔

''لوبیے اور مٹر کا ویسا ہی شوربا تیار کرو جو اس دن اس بڑھیا نے ہمیں پلایا تھا، جب ہم بھوکے پیاسے پہاڑی جنگل میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ اگر تم ویسا شوربا بنانے میں کام یاب ہو گئے تو ہم تمہارے دامن اشرفیوں سے بھر دیں گے۔

باورچیوں نے شاہی باغیچے سے تازہ مٹر اور لوبیے کے دانے منگوائے اور ان میں خوش بو دار مسالے ڈال کر نہایت خوش ذائقہ شوربا تیار کیا لیکن یہ شوربا بھی جاؤ کوانگ کو پسند نہ آیا۔ اس نے غصے سے پیالہ میز پر پٹک دیا اور چیخ کر بولا۔ ''تھو، تھو! اتنا بدمزہ شوربا میں نے زندگی میں کبھی نہیں پیا۔ تم کس منہ سے اپنے آپ کو شاہی باورچی کہتے ہو؟ اس سے اچھا شوربا تو وہ بڑھیا بنا لیتی ہے۔

دفع ہو جاؤ یہاں سے! ابھی اسی وقت۔''

وزیراعظم نے تمام باورچیوں کو برخاست کر دیا اور ان کی جگہ نئے باورچی رکھے لیکن ان کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلے باورچیوں کا ہوا تھا اور اس کے بعد تو ایسا ہوتا کہ صبح کو نئے باورچی بھرتی کیے جاتے اور شام کو ان کی چھٹی کر دی جاتی۔ جب ملک کے تمام باورچی آزمائے جا چکے اور کوئی بھی بادشاہ کی مرضی کا کھانا تیار نہ کر سکا تو وزیراعظم نے اس بڑھیا کی تلاش میں سپاہی دوڑائے جس نے جاؤ کوانگ کو مزے دار شوربا پلایا تھا۔

چند روز کی بھاگ دوڑ کے بعد سپاہی بڑھیا کو ڈھونڈنے میں کام یاب ہو گئے۔ انہوں نے اس سے کہا۔''مائی، اپنی ہنڈیا اور ڈوئی اٹھاؤ اور ہمارے ساتھ بادشاہ سلامت کے محل میں چلو۔'' بڑھیا بے چاری پریشان تو بہت ہوئی لیکن ڈر کے مارے بولی کچھ نہیں۔ اس نے مٹر اور لوبیے کے دانے پوٹلی میں باندھے، ہنڈیا اور ڈوئی بغل میں دبائی اور سپاہیوں کے ساتھ ہو لی۔

وزیراعظم سپاہیوں کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا، بڑھیا کو دیکھ کر کھل اُٹھا اور اسے شوربا تیار کرنے کا حکم دیا۔ بڑھیا نے ہنڈیا میں پانی بھر کر چولہے پر چڑھایا۔ جب پانی اُبلنے لگا تو اس میں مٹھی بھر لوبیا اور اتنے ہی مٹر ڈالے اور جب وہ پھول کر دوگنے ہو گئے تو نمک مرچ ڈالا اور پھر میلی چیکٹ کپی میں سے کڑوا تیل ڈال کر زور زور سے ڈوئی ہلانے لگی۔

شوربا تیار ہو گیا تو وزیراعظم نے چاندی کے پیالے میں ڈال کر جاؤ کوانگ کی خدمت میں پیش کیا۔ شوربا دیکھتے ہی بادشاہ خوشی سے جھوم اُٹھا اور بولا۔''بالکل ویسا ہی ہے، بالکل ویسا ہی، جیسا میں نے اس روز پیا تھا۔''

یہ کہہ کر اس نے پیالہ منہ سے لگایا لیکن پہلا گھونٹ ہی بھرا تھا کہ پیالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میز پر گر پڑا۔ اسے زور کی ابکائی آئی اور وہ چیخ کر بولا۔''نہیں، نہیں۔ یہ وہ شوربا نہیں ہے۔ یہ ہرگز وہ شوربا نہیں ہے۔ بڑھیا! معلوم ہوتا ہے تو پکانا بھول گئی ہے۔''

بڑھیا نے کہا۔''حضور، میں مدتوں سے یہ شوربا اسی طرح پکا رہی ہوں۔ میں نہیں بھولی، آپ بھول گئے ہیں۔''

''ہم بھول گئے ہیں؟'' جاؤ کوانگ حیرت سے بولا۔

''جی ہاں!'' بڑھیا نے کہا۔''آپ یہ بھول گئے ہیں کہ اس دن جب آپ میرے پاس آئے تھے تو کئی دنوں کے بھوکے تھے اور حضور، انسان بھوکا ہو تو اسے روکھی سوکھی روٹی بھی پلاؤ زردہ معلوم ہوتی ہے۔''

''تم سچ کہتی ہو، بڑی بی۔'' جاؤ کوانگ نے آہستہ سے کہا۔''تم نہیں بھولیں، ہم ہی بھول گئے تھے۔ ایسا شوربا دوبارہ تیار کرو۔ آج رات ہمارے تمام وزیر اور درباری یہی شوربا پئیں گے۔''

☆☆☆

رمپل ڈمپل

کسی گاؤں میں ایک کسان رہتا تھا۔ بہت بھولا اور سیدھا سادہ۔ اس کی بیوی مر گئی تھی۔ بس ایک لڑکی تھی۔ چندے آفتاب، چندے ماہ تاب۔ وہی کسان کی آنکھوں کا تارا اور دل کا سہارا تھی۔

کسان بے چارہ بہت غریب تھا۔ بڑی مشکل سے گزر بسر ہوتی تھی۔ ایک دن اس نے سوچا، بادشاہ کے پاس جاؤں۔ اسے اپنی دکھ بھری کہانی سناؤں۔ دوسرے دن وہ منہ اندھیرے گھر سے نکل کھڑا ہوا اور مارا مار کرتا شہر جا پہنچا، جہاں بادشاہ کا عالی شان محل کھڑا آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔

کسان نے محل کے پہرے داروں کو بتایا کہ وہ بادشاہ سے ملنا چاہتا ہے۔ انہوں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر خوب ہنسے۔ ایک پہرے دار نے کہا۔ ''جاؤ، جاؤ۔ اپنا کام کرو۔ بادشاہ سلامت تم جیسے پھٹیچر لوگوں سے نہیں ملتے۔''

کسان نے دیکھا کہ بات نہیں بنتی تو وہ اکڑ کر کہنے لگا۔ ''میں کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں۔ میری ایک لڑکی ہے جو چرخے میں تنکے کاتتی ہے تو وہ سونا بن جاتے ہیں۔''

پہرے داروں نے بادشاہ کو خبر کی اور بادشاہ نے کسان کو اندر بلا لیا۔ اس نے کسان سے کہا۔ ''اگر تمہاری لڑکی سچ مچ ایسی ہی ہے تو کل ہمارے محل میں لے آنا۔ اگر اس نے تنکوں کو سونا بنا دیا تو ہم تمہیں منہ مانگا انعام دیں گے۔''

کسان بھاگم بھاگ گھر آیا اور بیٹی کو ساری بات بتائی۔ بیٹی بولی۔ ''ابا، آپ نے جھوٹ کیوں بولا؟ میں بھلا تنکوں کو سونا کیسے بناؤں گی؟''

کسان نے کہا۔ ''بیٹی، میں نے یہ جھوٹ بادشاہ سے ملنے کے لیے بولا تھا۔ اب تم کل میرے ساتھ شاہی محل چلنا اور بادشاہ کو ساری بات سچ سچ بتا دینا۔ ہوسکتا ہے وہ رحم کھا کر ہمیں مالا مال کر دے اور ہمارے دن پھر جائیں۔''

دوسرے دن کسان بیٹی کو لے کر شاہی محل پہنچا۔ بادشاہ لڑکی کو ایک کمرے میں لے گیا جہاں ایک چرخہ، بہت سی دھاگے کی خالی ریلیں اور ڈھیروں گھاس پھوس بھرا ہوا تھا۔ بادشاہ نے لڑکی سے کہا۔ ''کل صبح تک اس تمام گھاس پھوس کو سونا بنا دو، ورنہ تمہیں پھانسی دے دی جائے گی۔''

بے چاری لڑکی، حیران پریشان، کبھی چرخے کو دیکھتی اور کبھی گھاس پھوس کے تنکوں کو۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ ان تنکوں کو سونا کیسے بنائے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ سسکیاں لے

لے کر رونے لگی۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک بونا اندر داخل ہوا۔ وہ اپنی سفید ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ''پیاری بچی، تم اس طرح بلک بلک کر کیوں رو رہی ہو؟''

لڑکی بولی۔ ''روؤں نہیں تو کیا ناچوں؟ بادشاہ نے کہا ہے کہ کل صبح تک ان تمام تنکوں کو کات کر سونا بنا دو، ورنہ تمہیں پھانسی دے دی جائے گی۔''

بونا، یہ سن کر، پھدک پھدک کر، ناچنے لگا۔ جب ناچتے ناچتے تھک گیا تو بولا۔ ''اگر میں یہ کام کر دوں تو تم مجھے کیا دو گی؟''

لڑکی نے کہا۔ ''میں تمہیں اپنا یہ ہار دے دوں گی۔''

بونے نے ہار لے لیا اور چرخہ کاتنے لگا۔ لڑکی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے دیکھا کہ چرخے میں سے خالص سونے کے تار نکل نکل کر ریلوں میں لپٹتے جا رہے ہیں۔ صبح ہونے تک تمام ریلیں سنہرے تاروں سے بھر گئیں اور کمرے میں ایک تنکا بھی نہ رہا۔

صبح کو بادشاہ آیا اور اتنا ڈھیر سارا سونا دیکھا تو بہت خوش ہوا۔ اس نے سوچا، یہ لڑکی تو بڑے کام کی ہے۔ اس سے اور سونا بنوانا چاہیے۔ وہ لڑکی کو دوسرے کمرے میں لے گیا، جو پہلے کمرے سے بڑا تھا اور اس میں پہلے سے زیادہ گھاس پھوس بھرا ہوا تھا۔ اس نے لڑکی سے کہا۔ ''اگر تم نے کل صبح تک ان تنکوں کو سونا نہ بنایا تو تمہاری گردن مار دی جائے گی۔''

بے چاری لڑکی پھر اپنے نصیبوں کو رونے بیٹھ گئی۔ ایکا ایکی دروازہ کھلا اور وہی، کل والا، بونا اندر آیا۔ اس نے کہا۔ ''اگر میں ان سارے تنکوں کو سونا بنا دوں تو مجھے کیا دو گی؟''

''اپنی یہ انگوٹھی۔'' لڑکی نے اسے اپنی انگلی دکھائی۔

بونے نے انگوٹھی لے لی اور چرخہ کاتنے لگا۔ وہ چرخہ چلا رہا تھا اور گھاس پھوس کے تنکے سونے کے تار بن بن کر ریلوں میں لپٹتے جا رہے تھے۔ صبح ہونے تک تمام ریلیں سونے کے تاروں سے بھر چکی تھیں۔

اس دن صبح کو بادشاہ آیا تو خوشی سے اُچھل پڑا۔ اس نے سوچا، یہ لڑکی تو مجھے دُنیا کا سب سے امیر آدمی بنا سکتی ہے۔ وہ اسے تیسرے کمرے میں لے گیا جو ان دونوں کمروں سے بڑا تھا، اور اس میں نیچے سے اوپر تک گھاس پھوس کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ بادشاہ نے لڑکی سے کہا۔ ''اگر تم نے کل صبح تک ان تمام تنکوں کو سونا بنا دیا تو میں تمہیں اپنی ملکہ بنا لوں گا لیکن اگر تم ایسا نہ کر سکیں تو پھر تمہاری خیر نہیں۔''

یہ کہہ کر بادشاہ تو چلا گیا اور غریب لڑکی سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور وہی بونا، دبے پاؤں اندر آیا۔ اس نے لڑکی سے کہا۔ ''اگر میں اس گھاس پھوس کو سونا بنا دوں تو تم مجھے کیا دو گی؟''

لڑکی روتے ہوئے بولی۔ ''اب تو میرے پاس تمہیں دینے کو کچھ بھی نہیں۔''

بونے نے کہا۔ ''اچھا، یہ وعدہ کرو کہ اگر تم ملکہ بن گئیں اور اللہ میاں نے تمہیں بیٹا دیا تو تم وہ بیٹا مجھے دے دو گی، بولو۔ منظور ہے۔''

لڑکی پہلے جھجکی۔ پھر جی کڑا کر کے بولی۔ ''منظور ہے۔''

بونا جلدی جلدی چرخہ چلانے لگا اور تنکے سونے کے تار بن بن کر ریلوں میں لپٹنے لگے۔ صبح کو بادشاہ کمرے میں آیا تو خوشی سے جھوم اُٹھا۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور کسان کی لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔

ایک سال بعد اللہ میاں نے ملکہ کو چاند سا ایک بیٹا دیا۔ بادشاہ اور ملکہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس عرصے میں ملکہ اپنا وہ وعدہ بھول چکی تھی جو اس نے بونے سے کیا تھا۔ دن یوں ہی ہنسی خوشی گزر رہے تھے کہ ایک دن، رات کو، بونا آ پہنچا اور اس نے ملکہ کو اس کا وعدہ یاد دلایا۔ ملکہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بونے کو

اس پر رحم آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''تمہیں تین دن کی مہلت دیتا ہوں۔ اگر تم نے ان تین دنوں میں یہ بتادیا کہ میرا نام کیا ہے تو میں تمہارا بچہ نہیں لوں گا۔''

اس رات اور پھر دوسرے دن ملکہ وہ تمام نام یاد کرتی رہی جو اس نے اپنے گاؤں میں سنے تھے۔ جب رات کو بونا آیا تو ملکہ نے کہا۔ ''تمہارا نام دینو ہے؟''

''نہیں۔'' بونا ہنس کر بولا۔

''گامو ہے؟'' ملکہ نے پوچھا۔

''نہیں، نہیں۔'' بونے نے جواب دیا۔

''کرمو ہے؟'' ملکہ نے پوچھا۔

''نہیں، نہیں، نہیں۔'' بونے نے قہقہہ لگا کر کہا۔

ملکہ اسی طرح، ایک کے بعد ایک، نام بولتی گئی اور بونا ''نہیں، نہیں'' کہتا گیا۔ جب تمام نام ختم ہو گئے تو بونا اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''کل پھر آؤں گا۔ بہت سے نام سوچ رکھنا۔''

دوسرے دن ملکہ نے اپنے ایک نوکر کو آس پاس کے گاؤں میں بھیجا اور اس سے کہا کہ وہاں کے تمام لوگوں کے نام لکھ لائے۔ اس طرح ناموں کی ایک لمبی چوڑی فہرست بن گئی۔

جب رات کو بونا آیا تو ملکہ نے اس سے کہا۔

''تمہارا نام شامو ہے؟''

''نہیں۔'' بونا ہنس کر بولا۔

''جانو ہے؟'' ملکہ نے پوچھا۔

''نہیں، نہیں۔'' بونے نے جواب دیا۔

''بھولو ہے؟''

''نہیں، نہیں، نہیں۔''

ملکہ ایک کے بعد ایک نام بولتی جاتی اور بونا ''نہیں، نہیں'' کہتا جاتا۔ جب تمام نام ختم ہو گئے تو بونا بولا۔ ''اب تمہارے پاس صرف کل کا دن اور ہے۔ کل بھی تم میرا نام بوجھ نہ پائیں تو میں تمہارا بچہ لے جاؤں گا۔''

تیسرے دن ملکہ نے پھر نوکر کو اِدھر اُدھر دوڑایا کہ وہ لوگوں کے نئے نئے نام لکھ کر لائے۔ شام کو نوکر تھکا ہارا، منہ لٹکائے، واپس آیا اور بولا۔ ''حضور، مجھے کوئی نیا نام تو ملا نہیں، البتہ پہاڑی کے اس طرف جو

جنگل ہے، وہاں میں نے ایک جھونپڑی دیکھی جس کے آگے الاؤ جل رہا تھا، اور اس الاؤ کے گرد ایک بونا ناچ ناچ کر گا رہا تھا:

حلوا پوری لاؤں گا
اور گلگلے پکاؤں گا
پھر شاہی محل جاؤں گا
ملکہ کا بیٹا لاؤں گا
نام ہے میرا رمپل ڈمپل
رمپل ڈمپل چیں پٹاخ

ملکہ نے یہ سنا تو خوشی سے اُچھل پڑی اور نوکر کو بہت سا انعام دیا۔ اس دن رات کو بونا آیا تو ملکہ بولی۔ ''تمہارا نام مولا بخش ہے؟''

''نہیں۔'' بونے نے ہنس کر کہا۔

''خدا بخش ہے؟''

''نہیں، نہیں۔''

''رمپل ڈمپل چیں پٹاخ؟'' ملکہ نے ہنس کر کہا۔

یہ سن کر بونے نے زور کی چیخ ماری، سر کے بال کھسوٹے، ڈاڑھی نوچ ڈالی اور بولا۔ ''ضرور تمہیں کسی جن نے بتایا ہے۔'' یہ کہتا ہوا وہاں سے ایسا بھاگا کہ پیچھے مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اس طرح ملکہ کی اس سے جان چھوٹی اور وہ اپنے شوہر اور چاند سے بیٹے کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگی۔ ☆☆☆

میاں الو کا گھونسلے سے نکلنا تھا کہ تمام جانور سنبھل کر بیٹھ گئے اور ان کا منہ تکنے لگے کہ دیکھیں آج گرو جی کون سی کہانی سناتے ہیں۔ میاں اُلو نے پہلے تو دو چار جمائیاں لیں، پھر ایک آنکھ میچ کر مینڈکی سے بولے:

''کیوں بی مینڈکی، اتنے دنوں سے کہاں تھیں؟ سنا ہے تمہیں زکام ہو گیا ہے؟''

مینڈکی بولی۔ ''زکام ہو میرے دشمنوں کو۔ میں تو بھلی چنگی ہوں۔ بات یہ ہے کہ میرے گھر سرحدی علاقوں کے چند بے گھر لوگ آ گئے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال میں لگی ہوئی تھی۔''

میاں اُلو خوش ہو کر بولے۔ ''جیتی رہو۔ مصیبت زدوں کی مدد کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔ اور پھر وہ تو تمہارے ہم وطن ہیں۔''

گائے بولی۔ ''ٹھیک ہے گرو جی، اب آپ جھٹ پٹ کوئی مزے دار کہانی سنا دیجئے۔''

میاں اُلو آہ بھر کر بولے۔ ''ہائے! تمہیں کہانیوں کی پڑی ہے اور مجھے ملک و قوم کا غم کھائے جا رہا ہے۔ خیر، تمہارا دل توڑنا نہیں چاہتا۔ اس لیے سنائے دیتا ہوں۔ لو سنو۔ یہ کہانی ایک بطخ چور کی ہے۔

''ایک دن شام کے وقت ایک بطخ میرے پاس آئی اور بڑی عاجزی سے بولی۔ ''گرو جی، سنا ہے آپ جانوروں کے بڑے ہمدرد ہیں۔ کسی پر کوئی مصیبت آ پڑے تو اس کی مدد کرتے ہیں۔ میں دکھیا، مصیبت کی ماری آپ کے پاس اپنا دکھڑا لے کر آئی ہوں۔ خدا کے لیے میری مدد کیجئے۔''

میں نے کہا۔ ''نہ نہ نہ۔ تمام تعریفیں ثابت ہیں واسطے اللہ کے جو سارے جگ کا پالن ہار ہے۔ یہ بندۂ ناچیز فقیر حقیر کس لائق ہے۔ پھر بھی تم اپنا حال سناؤ۔ شاید میں کچھ کر سکوں۔''

بطخ بولی۔ ''میرا نام نور جہاں ہے.....''

مینڈکی نے پوچھا۔ ''کون سی نور جہاں؟ جہانگیر بادشاہ والی یا یہ اپنی ملکہ ترنم؟''

میاں اُلو ہنس کر بولے۔ ''اری بے وقوف، وہ تو انسان ہیں اور تمہیں بطخ کی کہانی سنا رہا ہوں خیر، تو قصہ سنو۔ بطخ بولی۔ ''میرا نام نور جہاں ہے اور میں پاس کے گاؤں میں رہتی ہوں۔ میرے ساتھ اور بھی بہت سی بطخیں رہتی ہیں۔ ہمارا مالک بہت شریف اور نیک انسان ہے۔ ہمارا بہت خیال رکھتا ہے لیکن بے چارے کا گھر اتنا چھوٹا ہے کہ رات کو ہمیں گھر نہیں لے جا سکتا۔ اس لیے ہم دن رات گاؤں کے تالاب میں پڑے رہتے ہیں۔

''ایک ہفتہ ہوا کہ تالاب کا پانی آہستہ آہستہ خشک ہونے لگا اور تین چار دنوں میں بالکل سوکھ گیا۔ ہم لوگ بڑے گھبرائے مگر

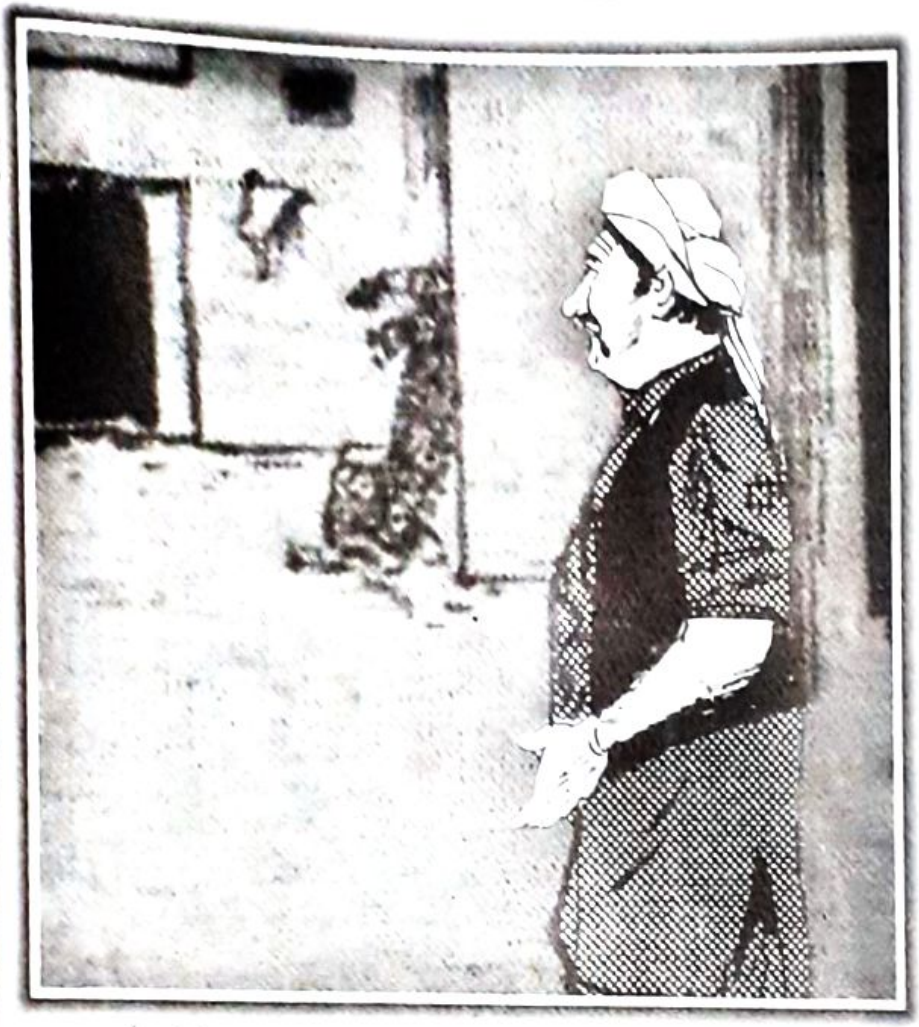

صبر کر کے بیٹھ گئے۔ لیکن اب پرسوں سے یہ ہونے لگا ہے کہ صبح کو جب ہم سو کر اٹھتے ہیں تو دو تین بطخیں غائب ہوتی ہیں۔ خوف کے مارے ہمارا برا حال ہے اور ہمارا مالک بھی بہت پریشان ہے۔''

میں نے تھوڑی دیر سر کھجایا، سوچا اور پھر بولا۔ ''بی نور جہاں، تمہاری بپتا سن کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ لیکن افسوس ہے کہ میں تالاب میں پانی نہیں بھر سکتا۔ یہ پانی کسانوں نے اپنے کھیتوں میں دے لیا ہے۔ اب تمہیں بارش کا انتظار کرنا پڑے گا۔ ہاں! میں بطخ چور کا پتا چلا سکتا ہوں۔''

نور جہاں پھڑک کر بولی۔ ''گرو جی زندہ باد! واقعی جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ سچ مچ آپ قطب ہیں۔ اگر آپ نے اس موئے چور کو پکڑوا دیا تو میں آپ کو بیس انڈے دوں گی۔''

میں دانت نکوس کر بولا۔ ''خیر، یہ تو تمہارا خیال ہے۔ میں نہ تو قطب ہوں اور نہ قطب صاحب کی لاٹھ۔ خدا کا سیدھا سادہ بندہ ہوں اور اپنی خدمت کا کوئی صلہ نہیں لیتا۔ ہاں، البتہ کوئی نذرانہ دے تو قبول کر لیتا ہوں۔ اچھا بی نور جہاں، اب تم جاؤ۔ کل شام کو میرے پاس آنا۔ خدا حافظ۔'' بطخ چلی گئی۔

معاملہ بڑا ٹیڑھا تھا لیکن بھائیو، میں بھی تمہارا پھوکٹ کا گرو نہیں۔ کچھ ہوں جبھی تو سارے جانور میرے آگے سر جھکاتے ہیں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد ایک ترکیب میری سمجھ میں آ ہی گئی۔ مگر ابھی نہیں بتاؤں گا۔ چپ چاپ سنتے رہو۔

دوسرے دن شام کو نور جہاں آئی اور آتے ہی بولی۔ ''کیوں گرو جی؟ سوچی کوئی ترکیب؟''

میں نے کہا۔ ''تدبیر کیا۔ اللہ والوں کی باتیں ہیں۔ جب موج میں آ گئے تو کر دیا بیڑا پار۔ اچھا اب وقت برباد نہ کرو اور جیسا میں کہوں، ویسا کرو۔ تالاب کے پاس برگد کا جو درخت ہے، اس کے پیچھے چھپ کر بیٹھ جاؤ۔ اپنی سہیلیوں کو بھی لیتی جانا اور خبردار، آواز کوئی نہ نکلے۔ چپ چاپ دم سادھے بیٹھی رہنا۔''

بطخ کے جانے کے بعد میں وقت کاٹنے کے لیے ادھر ادھر چکر کاٹنے لگا۔ جب رات کے بارہ بجے، چاروں طرف سناٹا چھا گیا تو اس برگد کے پاس پہنچا جہاں نور جہاں اور اس کی سہیلیاں بیٹھی اونگھ رہی تھیں۔

نور جہاں نے میری آہٹ پائی تو چونک کر بولی: ''کون؟''

میں نے کہا۔ ''چپ خاموش۔'' وہ سہم کر بیٹھ گئی۔ برگد کی سیدھ میں کچھ فاصلے پر، ببول کا درخت تھا۔ میں اس پر جا کر بیٹھ گیا۔

چاروں طرف گھور اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا لیکن میری آنکھیں اندھیرے ہی میں کام کرتی ہیں۔ بیٹھے ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ پاس کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ کی آواز آئی۔ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کوئی آدمی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ تالاب کی طرف آ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی حضرت روزانہ بطخیں اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ فاصلے کی وجہ سے ابھی تک اس کی شکل نظر نہیں آئی تھی۔ وہ تالاب کے کنارے بطخوں کو تلاش کر رہا تھا۔

مگر وہاں کوئی بطخ ہوتی تو ملتی۔ آخر تھک ہار کر وہ ایک جگہ ٹھہر گیا اور بولا۔

''آج شاید فتو انہیں گھر لے گیا ہے۔ میں نے بھی تو حد کر دی تھی۔ روز ہی چرانے لگا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ واپس جانے کے لیے مڑا اور جب ببول کے پیڑ کے پاس سے گزرا تو میں نے جھٹ پہچان لیا۔ ''آخاہ! یہ تو اپنے گاؤں کے حجام راجا علم دین ہیں۔ خوب راجا جی۔ لوگوں کی حجامتیں بناتے بناتے اب بطخوں کی حجامتیں بنانے لگے۔ ٹھہر جا بچو، تو بھی کیا یاد کرے گا۔''

علم دین کا گھر گاؤں کے کنارے پر ہی تھا۔ وہ پھوکے پھوکے قدموں سے دروازے پر پہنچا اور پھر گھر میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔

اب میری باری تھی۔ میں دیوار پر سے ہو کر صحن میں پہنچا اور ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی کے پیچھے چھپ کر زور سے بطخ کی آواز نکالی۔ ''قیں۔ قیں۔ قیں۔'' علم دین نے یہ آواز سنی تو چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ میں چپکے سے کھسک کر دوسری طرف چلا گیا اور پھر بولا۔ ''قیں۔ قیں۔''

وہ سٹ پٹا کر ادھر دوڑا تو میں چپکے سے وہاں سے بھی کھسک گیا اور دوسری جانب جا کر قیں قیں کرنے لگا۔ وہ حیرت سے بولا۔ ''خدا معلوم کوئی بطخ ہے یا میرا ہی دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

غرض آدھے گھنٹے تک میں اسے یوں ہی پریشان کرتا رہا۔ آخر وہ اتنا خوف زدہ ہو گیا کہ دیوانوں کی طرح گاؤں کی گلیوں میں دوڑنے لگا۔

دوسرے دن نور جہاں آئی تو اس کی زبانی معلوم ہوا کہ گاؤں کا نائی علم دین پاگل ہو گیا ہے اور گاؤں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

میں نے ہنس کر کہا۔ ''اری بھولی رانی، یہی تو وہ چنڈال تھا جو بطخوں کو اڑا کر لے جاتا تھا۔ چلو قصہ پاک ہوا۔ اب جہاں چاہو، رہو۔''

نور جہاں تعجب سے بولی۔ ''اے مجھ نگوڑی کو کیا پتا کہ یہ اس موئے کی کارستانی تھی۔ گرو جی، آپ سچ مچ بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ آپ نے ہمارے اوپر وہ احسان کیا ہے کہ.....''

میں جلدی سے بولا۔ ''چھوڑو ان باتوں کو اور خدا کا شکر کرو۔ میں نے تو اپنا فرض ادا کیا ہے۔''

''تو میرے بچو، اس طرح میری عقل مندی سے بے چاری بطخوں کو علم دین کے ظلم سے نجات مل گئی۔ اچھا۔ اب گھر جاؤ۔ رات بھیگ رہی ہے۔''

لومڑی بولی۔ ''ہائے! میڈم نور جہاں یہاں ہوتیں تو ان سے وہ گانا ہی سن لیتے۔ کون سا بھلا؟''

مینا چہک کر بولی۔

''اے وطن کے سجیلے جوانو''

گرو جی بھنا کر بولے۔ ''اتنا سمجھایا پر خاک سمجھ میں نہ آیا۔ ارے بھئی، یہ گانا جس نور جہاں نے گایا ہے وہ انسان ہے اور میں نے جس نور جہاں کی کہانی تمہیں سنائی ہے وہ جانور ہے۔ اب جا کر آرام کرو۔ کل تمہیں ایک اور مزے دار کہانی سناؤں گا۔''

☆☆☆

(بقیہ: جمیل الدین عالی)

پاکستان کی پہلی اردو یونی ورسٹی کے قیام میں جمیل الدین عالی کا کردار نہایت اہم رہا ہے۔ اس کا افتتاح 2002ء میں ہوا۔ اگلے سال عالی صاحب کو اس کا ڈپٹی چانسلر بنا دیا گیا۔ یہ وفاقی ادارہ ہے جس کے چانسلر صدر پاکستان ہوتے ہیں۔

جمیل الدین عالی کے قومی نغموں کا مجموعہ ''جیوے جیوے پاکستان'' شائع ہو چکا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ انہوں نے پاکستان کو اپنے سامنے بنتے دیکھا ہے۔ وہ قائداعظم محمد علی جناحؒ اور خواجہ ناظم الدین کے قریب بھی رہے اور کام کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے۔ ''میں جس روز بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان پہنچا تھا۔ اسی شام پاکستان بن گیا تھا۔ میں پاکستان سے سچا عشق کرتا ہوں۔ پاکستان کا مستقبل بہت روشن ہے۔ قدرت نے اس ملک کو بہت کچھ دیا ہے۔ دریا، سمندر، کھیت کھلیان، باغات، سونا اگلنے والی زمین اور بہت کچھ دیا ہے۔ دنیا کے 180 ممالک میں کئی ممالک ایسے ہیں جہاں دریا نہیں۔ 80 سے زائد ممالک میں گندم پیدا نہیں ہوتی۔ 17 ممالک ایسے ہیں جہاں سمندر نہیں ہیں۔''

ان کے کام کی دنیا بھر میں پذیرائی ہوئی۔ ان کے اعزاز میں سعودی عرب، کینیڈا اور امریکا کے کئی شہروں میں ''جشن عالی'' کا اہتمام کیا جا چکا ہے۔ حکومت پاکستان نے انہیں صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی (ادب 1991ء)، ہلال امتیاز (1998ء) دیا۔ 1998ء میں کراچی یونی ورسٹی نے ڈی لٹ (ڈاکٹر آف لٹریچر) کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ عالی صاحب کا انتقال 23 نومبر 2015ء کو ہوا۔

☆☆☆

جادو کا موتی

ویت نام کے کسی گاؤں میں ایک شکاری رہتا تھا۔ نام تھا' ڈاٹرانگ۔ نام ذرا مشکل ہے' لیکن کیا کریں۔ جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں (ویت نام' کمبوڈیا' لاؤس' سنگاپور' انڈونیشیا' تھائی لینڈ وغیرہ) کے لوگوں کے نام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ تو خیر' اس ڈاٹرانگ کا آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ بالکل اکیلا ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں رہتا تھا۔ ایسے ہی آدمی کے بارے میں کہتے ہیں: جورو نہ جاتا' اللہ میاں سے ناتا۔ جورو بیوی کو کہتے ہیں۔ جاتا کا مطلب ہے' ذات برادری۔ اور ناتا کے معنی ہیں' رشتہ۔ ناتا کو بہت سے لوگ ناطہ لکھتے ہیں جو ایسا ہی غلط ہے جیسے گرم مسالا کو گرم مصالحہ لکھنا۔ اچھا' اب کہانی سنیے۔

ایک دن ڈاٹرانگ جنگل میں شکار تلاش کر رہا تھا کہ اسے ایک شکرا نظر آیا' جو نیچے' زمین پر' رینگتے ہوئے ایک سانپ پر جھپٹنے ہی والا تھا۔ نہ جانے کیوں' ڈاٹرانگ کو سانپ پر ترس آگیا۔ اس نے تیر مار کر شکرے کو مار گرایا۔

سانپ بھاگتے بھاگتے رک گیا' پھن اٹھا کر ڈاٹرانگ کو دیکھا' اور پھر بولا "تمہارا بہت بہت شکریہ' ڈاٹرانگ۔"

ڈاٹرانگ نے حیرت سے آنکھیں ملیں تو سانپ نے کہا "حیران نہ ہو۔ میں سانپ نہیں' پانی کی روح ہوں۔ تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے' میں اس کا بدلہ دینا چاہتا ہوں۔ یہ لو۔ یہ جادو کا موتی ہے۔ اسے زبان کے نیچے رکھو گے تو دنیا کے ہر جانور کی بولی کا مطلب سمجھ سکو گے۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ اپنے اس علم کو نیک کاموں میں استعمال کرنا۔"

اور اس سے پہلے کہ ڈاٹرانگ کا حیرت سے کھلا ہوا منہ بند ہوتا' سانپ غائب ہوگیا۔

اسی وقت ڈاٹرانگ کو ایک پہاڑی کوے کی کائیں کائیں سنائی دی۔ اس نے جادوئی موتی زبان کے نیچے رکھا اور کوے کی کائیں کائیں کی طرف کان لگا دیئے۔ کوا کہہ رہا تھا "یہاں قریب ہی ایک جھاڑی میں ایک موٹا تازہ ہرن بیٹھا ہے۔ اگر تم وعدہ کرو کہ اس کی کلیجی مجھے دو گے تو میں تمہیں وہاں لئے چلتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے" ڈاٹرانگ بولا "میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہرن کی کلیجی تمہیں دے دوں گا۔"

کوا ڈاٹرانگ کو اس جھاڑی کے پاس لے گیا جس میں ہرن بیٹھا تھا۔ ڈاٹرانگ نے تیر سے ہرن کو مار گرایا' اس کی کلیجی کوے کو دی اور گوشت گھر لے گیا۔ اس دن سے وہ

دونوں مل کر شکار کرنے لگے۔ دونوں خوش تھے۔ ڈاٹرانگ کو شکار کے لئے زیادہ دوڑ دھوپ کرنی نہیں پڑتی تھی' اور پہاڑی کوے کو مفت میں کلیجی مل جاتی تھی۔

ایک دن کوے کو آنے میں دیر ہوگئی تو ڈاٹرانگ اکیلا ہی شکار کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک پاڑا مارا اور اس کی کلیجی درخت کی شاخ پر رکھ دی کہ کوا آکر کھالے گا۔ لیکن وہ کلیجی کوئی دوسرا پرندہ کھا گیا۔ اتنے میں کوا کائیں کائیں کرتا ہوا آگیا۔ اسے کلیجی نہیں ملی تو اس نے ڈاٹرانگ کو خوب برا بھلا کہا۔ ڈاٹرانگ کو غصہ آگیا۔ اس نے کمان میں تیر لگایا اور کوے کا نشانہ لے کر چھوڑ دیا۔ کوا اچھل کر ایک طرف ہوگیا اور تیر کچھ دور جاکر زمین پر گر پڑا۔

اب تو کوا غصے سے تن فن ہوگیا۔ چیخ کر بولا "پہلے تم نے وعدہ خلافی کی اور اب میری جان لینے کی کوشش کی۔ تمہیں اس کی سزا ملے گی۔ تم احسان فراموش ہو۔" یہ کہہ کر اس نے تیر کو چونچ میں دبایا اور گاؤں کی طرف اڑ گیا۔ گاؤں کے پاس ایک نہر تھی۔ اس نہر میں کسی آدمی کی لاش پڑی تھی۔ شاید ڈوب کر مرگیا تھا۔ کوے نے ڈاٹرانگ کا تیر مردے کے جسم میں گھونپ دیا' اور جنگل کی طرف اڑ گیا۔

کچھ دیر بعد چند لوگ نہر کے پاس سے گزرے۔ انہوں نے نہر میں لاش دیکھی تو رک گئے۔ لاش میں تیر لگا ہوا تھا۔ یہ تیر ڈاٹرانگ کا تھا۔ انہوں نے پولیس کو خبر کردی' اور پولیس نے ڈاٹرانگ کو قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا۔

اب بے چارہ ڈاٹرانگ جیل کی کال کوٹھری میں پڑا آہیں بھرتا تھا۔ اس کوٹھری میں اس کے سوا اور کوئی نہ تھا کہ اس کے ساتھ باتیں کرکے دل بہلاتا۔ بس مکھی مچھر تھے یا پسو اور چوہے جو ادھر ادھر دوڑتے پھرتے تھے۔ ڈاٹرانگ نے سوچا' چلو انہی کی باتیں سن کر وقت گزاروں۔ اب وہ' صبح ہوتے ہی' جادوئی موتی زبان کے نیچے رکھ لیتا اور ان جانوروں کی باتیں سنتا۔ یہ باتیں اتنی دل چسپ ہوتی تھیں کہ اسے پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ کب صبح ہوئی اور کب رات۔

ایک دن' صبح کو' اس کی کوٹھری کے روشن دان پر دو چڑیاں آکر بیٹھیں۔ اس نے جادو کا موتی زبان کے نیچے رکھا اور ان کی باتیں سننے لگا۔ ایک چڑیا دوسری چڑیا سے کہہ رہی تھی "اس ملک کا بادشاہ بہت بے وقوف ہے۔ اس کے غلے کے گودام سے روز' رات کو' چور چاولوں کی بوریاں چرا کر لے جاتے ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو چند دنوں میں سارا گودام خالی ہوجائے گا۔"

ڈاٹرانگ نے جیلر کو بلایا اور اسے یہ بات بتائی۔ جیلر کو اس کی بات کا یقین نہ آیا۔ اس نے کہا "تم کوئی جادوگر ہو کہ تمہیں یہاں بیٹھے بیٹھے چوری کی خبر مل گئی؟"

ڈاٹرانگ بولا "اگر میری بات غلط ہو تو مجھے پھانسی دے دی جائے۔"

جیلر نے کوتوال سے بات کی' کوتوال نے وزیر کو اطلاع دی' اور وزیر نے یہ بات بادشاہ کو کہہ سنائی۔ بادشاہ کے کان کھڑے ہوئے۔ اسی رات بادشاہ کے سپاہیوں نے گودام پر چھاپا مارا اور چوروں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ گودام کے چوکی دار چوروں سے ملے ہوئے تھے۔ وہ بھی پکڑے گئے۔

بادشاہ نے خوش ہوکر' وزیر کو 100 اشرفیاں دیں۔ وزیر نے خوش ہوکر' کوتوال کو 10 اشرفیاں دیں۔ کوتوال نے' خوش ہوکر' جیلر کو ایک اشرفی دی۔ ڈاٹرانگ کو پھوٹی کوڑی بھی نہ ملی۔

چند دن بعد ڈاٹرانگ نے دیکھا کہ اس کی کوٹھری کی چیونٹیاں باہر بھاگ رہی ہیں۔ ایک چیونٹی کہہ رہی تھی "چلو' چلو' کسی اونچی جگہ چلو۔ پہاڑوں پر موسلا دھار بارشیں ہو رہی ہیں۔ دریا لبالب بھر گئے ہیں۔ سیلاب آنے والا ہے۔ تمام گاؤں' کھیت اور کھلیان بہ جائیں گے۔"

ڈاٹرانگ نے یہ بات جیلر کو بتائی۔ جیلر نے کوتوال کو بتائی' کوتوال نے وزیر سے کہا اور وزیر نے بادشاہ کو بتایا۔

بادشاہ نے اسی وقت گاؤں گاؤں ہرکارے بھیج کر لوگوں کو خبردار کردیا۔ لوگوں نے' جلدی جلدی' دریاؤں کے کنارے اونچے کئے اور کنکر پتھر ڈال کر پشتوں کو مضبوط کردیا۔ اور اس طرح سیلاب کا پانی بغیر کوئی نقصان پہنچائے' گزر گیا۔

بادشاہ نے وزیر سے پوچھا کہ تمہیں غیب کی یہ باتیں کون بتاتا ہے؟ وزیر نے کہا "کوتوال۔" کوتوال بولا "جیلر" اور جیلر بولا "ڈاٹرانگ' جو میری جیل میں قید ہے۔" بادشاہ نے اسی وقت ڈاٹرانگ کو بلایا اور اس سے دریافت کیا کہ تمہیں غیب کی باتیں کیسے معلوم ہوتی ہیں؟ ڈاٹرانگ نے سب کچھ سچ سچ بتادیا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اس نے سوچا' یہ آدمی تو بڑے کام کا ہے۔ ہمیں آنے والے خطروں سے آگاہ کرتا رہے گا۔ اس نے ڈاٹرانگ کو اپنا وزیر بنالیا اور شاہی محل میں اس کے رہنے کا انتظام کردیا۔

بادشاہ سلطنت کے کام کاج سے فارغ ہوتا تو ڈاٹرانگ کو لے کر کسی باغ یا جنگل میں چلا جاتا اور ڈاٹرانگ اسے مختلف جانوروں کی باتیں سناتا۔ بادشاہ بہت خوش ہوتا اور اسے خوب انعام واکرام دیتا۔

ڈاٹرانگ عیش و آرام میں ایسا مست ہوا کہ اپنے گاؤں کے ان لوگوں کو بھی بھول گیا جو اڑے وقتوں میں اس کی مدد کرتے تھے۔ وہ موتی والے اس سانپ کی یہ نصیحت بھول گیا کہ اپنے اس علم کو نیک کاموں میں صرف کرنا۔ اس کے پاس اتنی دولت جمع ہوگئی تھی کہ وہ چاہتا تو غریبوں کے لئے لنگر خانے' مسافرخانے' یتیم خانے اور اسکول کھول سکتا تھا' یتیموں اور بیواؤں کے وظیفے لگاسکتا تھا' اور غریبوں کی بیٹیوں کے بیاہ کرسکتا تھا۔ لیکن اس نے ایسا کوئی کام نہ کیا۔ اپنی ہی کھال میں مست رہا۔

ایک دن بادشاہ نے دریا کی سیر کا ارادہ کیا۔ فوراً شاہی کشتی تیار کی گئی' اور جب بادشاہ اس میں سوار ہوگیا تو تین درجن غلاموں نے اسے کھینا شروع کردیا۔ پانی میں رنگ برنگ مچھلیاں تیر رہی تھیں' اور ڈاٹرانگ ان کی دل چسپ باتیں بادشاہ کو سنا رہا تھا۔ اچانک ایک مچھلی نے کوئی ایسی بات کہی کہ جسے سن کر ڈاٹرانگ نے زور کا قہقہہ لگایا۔ اس وقت وہ مچھلیوں کی باتیں سننے کے لئے نیچے جھکا ہوا تھا۔ اس کا منہ کھلا تو موتی زبان کے نیچے سے نکل کر پانی میں گر پڑا! بادشاہ نے غوطہ خوروں کو حکم دیا کہ وہ پانی میں سے موتی نکال کرلائیں۔ غوطہ خوروں نے تمام دریا کھنگال ڈالا' موتی کا کہیں پتا نہ چلا۔

بادشاہ کچھ دن تو اداس رہا۔ پھر اس نے اپنی تفریح کا دوسرا سامان کرلیا اور ڈاٹرانگ کو محل سے نکال دیا۔ بادشاہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ڈاٹرانگ رنجیدہ' غم زدہ' دریا کے کنارے بیٹھ گیا اور ریت میں موتی تلاش کرنے لگا۔ وہ ہاتھوں میں ریت بھرتا اور پھر اسے ہوا میں اڑاتا۔ اسے امید تھی کہ اس کا کھویا ہوا موتی اسے مل جائے گا۔ لیکن بے سود۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ اس کی کمر جھکے جھکے' کبڑی ہوگئی۔ ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔ اب اس سے کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ وہ کیکڑا بن گیا تھا!

آپ کو کبھی جنوبی چین کے ساحلوں پر جانے کا اتفاق ہو تو آپ کو وہاں سینکڑوں چھوٹے چھوٹے کیکڑے اپنے پنجوں سے ریت کھودتے اور اس میں کچھ تلاش کرتے نظر آئیں گے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ڈاٹرانگ کی اولاد ہیں' اور اس موتی کو تلاش کررہے ہیں جو سینکڑوں سال پہلے دریا میں گر گیا تھا۔ (سعید لخت)

لنکن کی پھلجھڑیاں

امریکا کے عوام اپنے جن لیڈروں کا نام نہایت عزت اور محبت سے لیتے ہیں، ان میں ایک لیڈر ابراہام لنکن بھی تھا۔ وہ آج سے 186 سال پہلے (1809ء میں) امریکا کی ایک ریاست، کینن ٹکی، کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک غریب بڑھئی تھا اور یہ لوگ لکڑی کے ایک کیبن میں رہتے تھے۔

لنکن کی شکل و صورت اچھی نہ تھی، لیکن قدرت نے اسے دماغ بہت اعلیٰ عطا کیا تھا۔ اس نے اپنی ذاتی محنت اور شوق سے تعلیم حاصل کی اور پھر سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ 25 سال کی عمر میں وہ امریکی ریاست الی نوائے کی قانون ساز اسمبلی کا رکن چنا گیا اور 1846ء میں امریکی کانگرس کا ممبر منتخب ہوا۔ 1860ء میں اس نے صدارتی انتخاب میں حصہ لیا اور بھاری ووٹوں سے ریاست ہائے متحدہ امریکا کا سولہواں صدر چنا گیا۔

لنکن نے صدر بننے کے بعد اپنے عوام کی بھلائی کے بہت سے کام کیے۔ لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ امریکا میں غلامی کا خاتمہ تھا۔ اس نے صدر بنتے ہی غلامی کو خلاف قانون قرار دے دیا، اور اس طرح وہ لاکھوں حبشی (نیگرو) غلام آزاد ہوگئے جن سے ان کے سفید چمڑی والے آقا اپنے کھیتوں میں جانوروں کی طرح کام لیتے تھے۔ افسوس کہ امریکا کے اس شریف اور نیک دل صدر کو 1865ء میں، ایک ایکٹر، جان بوتھ، نے اس وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا جب وہ ایک تھیٹر میں ڈراما دیکھ رہا تھا۔

لنکن بہت زندہ دل اور حاضر جواب تھا۔ اس کے بہت سے لطیفے اور چٹکلے مشہور ہیں۔ چند لطیفے آپ بھی سنئے۔

لنکن کو اپنی بدصورتی کا خود بھی احساس تھا۔ ایک دفعہ اس نے اپنے پرائیویٹ سکریٹری سے کہا تھا "خدا کو معمولی شکل و صورت کے لوگ اچھے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے خوب صورت لوگ کم اور معمولی شکل کے لوگ زیادہ پیدا کیے ہیں۔"

ایک دن لنکن کے چند دوست اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ لمبی ٹانگیں اچھی ہوتی ہیں یا چھوٹی ٹانگیں۔ انہوں نے لنکن کی رائے پوچھی تو وہ بولا "میرے خیال میں، ایک آدمی کی ٹانگیں اتنی لمبی ہونی چاہئیں کہ وہ زمین تک پہنچ جائیں۔"

ایک دن لنکن جنگل میں سے گزر رہا تھا کہ اسے ایک شکاری ملا۔ اس نے بندوق کی نال لنکن کے سینے پر رکھی اور بولا "میں نے قسم کھائی تھی کہ اگر میں نے کبھی کوئی ایسا آدمی دیکھا جو مجھ سے زیادہ بدصورت ہوا تو میں اسے گولی مار دوں گا۔"

لنکن نے آہ بھر کر کہا "ٹھیک ہے، بڑے بھائی۔ اگر میں واقعی تم سے زیادہ بدصورت ہوں تو بے شک مجھے گولی مار دو۔"

لنکن نے قانون کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ لیکن چوں کہ اس کی شکل اچھی نہ تھی' اس لئے اسے مقدمے بہت کم ملتے تھے اور اس کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ بعض وقت تو اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہ ہوتے تھے کہ وہ کسی کرائے کی گاڑی میں سفر کرسکے۔

ایک دن وہ اپنے کسی دوست سے ملنے پیدل اس کے گاؤں جارہا تھا کہ اس کے پاس سے ایک گھوڑا گاڑی گزری۔ وہ گاڑی والے سے لفٹ لینا چاہتا تھا' لیکن اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں وہ انکار نہ کردے۔

اس نے گاڑی والے سے کہا "بڑے بھائی' کیا آپ گاؤں جارہے ہیں؟"

"جی ہاں" گاڑی والے نے کہا "ادھر ہی جارہا ہوں۔"

لنکن بولا "کیا آپ' مہربانی کرکے' میرا یہ کوٹ وہاں لے جائیں گے؟"

"بڑی خوشی سے" گاڑی بان نے کہا "لیکن آپ اسے واپس کیسے لیں گے؟"

"میں اسے پہنے رہوں گا" لنکن نے جواب دیا۔

ایک دن ایک مضمون نگار اپنا ایک مضمون لے کر لنکن کے پاس آیا۔ مضمون بہت لمبا' خشک اور اکتا دینے والا تھا۔ پھر بھی لنکن بڑے صبر وسکون سے سنتا رہا۔ جب مضمون ختم ہوا تو مضمون نگار نے لنکن سے پوچھا "آپ کی رائے میں میرا یہ مضمون لوگ پسند کریں گے؟"

لنکن نے جواب دیا "میرے خیال میں جو لوگ اس قسم کی چیزیں پسند کرتے ہیں' وہ ضرور پسند کریں گے۔"

لنکن امریکا کا صدر بننے کے بعد بھی اپنے جوتوں پر خود پالش کرتا تھا' حال آں کہ صدارتی محل (وہائٹ ہاؤس) میں بیسیوں نوکر موجود تھے۔

ایک دن' صبح کو' امریکی سینٹ کا ایک ممبر' چارلس سم نر' لنکن سے ملنے وہائٹ ہاؤس آیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ امریکا کا صدر اپنے جوتوں پر خود پالش کر رہا ہے!

اس نے کہا "مسٹر لنکن! شریف آدمی اپنے جوتے خود پالش نہیں کرتے۔"

لنکن بولا "پھر وہ کس کے جوتے پالش کرتے ہیں؟"

(س۔ ل)

ٹھواں

سعید لخت

چھٹی کا دن تھا اور صبح کا وقت۔ میں، شمیم آپا اور ریحان ٹی وی پر جنگلی جانوروں کی فلم دیکھ رہے تھے کہ ہماری نوکرانی، ماسی، بھاگی بھاگی آئی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ بولی "چھوٹے صاحب جی، بی بی جی-----"

"کیا ہوا؟ قیامت آگئی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جی، قیامت نہیں---- ٹھواں!" ماسی بولی۔

میں نے شمیم آپا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا "ٹھواں؟ ٹھواں کیا؟"

"ٹھواں؟" شمیم آپا سوچتے ہوئے بولیں "یہ شاید دھواں کہہ رہی ہے"۔

"او جی، بی بی جی، دھواں نہیں، ٹھواں" ماسی نے کہا "چل کر دیکھیں۔ دیوار پر بیٹھا ہے"۔

"چلو، بھئی۔ دیکھتے ہیں" شمیم آپا بولیں اور ہم تینوں اٹھ کر ماسی کے ساتھ باہر گئے۔ باہر، لان کی بائیں دیوار پر، زمین سے کوئی دو فٹ اوپر، ایک بچھو چمٹا ہوا تھا۔

"ارے، ماسی، یہ تو بچھو ہے" میں نے کہا۔

"او مائی گاڈ!" شمیم آپا بولیں "It is a Scorpion." شمیم آپا کو انگریزی بولنے کا بہت شوق ہے۔

"جاؤ، ریحان۔ ڈیڈی کو بلا کر لاؤ" میں نے کہا۔

ریحان کے جانے کے بعد میں نے ذرا قریب سے بچھو کا معاینہ کیا۔ وہ دو انچ کے قریب لمبا اور مٹیالے رنگ کا تھا۔ اس کی آٹھ ٹانگیں تھیں اور سر کے دونوں طرف دو بازو تھے، جن کے سرے پر پنجے تھے۔ جسم کے پیچھے اوپر کو اٹھی ہوئی دم تھی جو بل کھا کر پیٹھ پر آگئی تھی۔ اس دم کے سرے پر ایک مڑا ہوا، نوکیلا ڈنک تھا جو سوئی کی طرح چمک رہا تھا۔ اس کا پیٹ غبارے کی طرح کبھی پھولتا اور کبھی پچک جاتا۔

اسی وقت ریحان کی آواز سنائی دی "یہ دیکھیے، ڈیڈی۔ دیوار سے چمٹا ہوا ہے۔ ماسی اسے ٹھواں کہہ رہی تھی، اور بھائی جان نے بچھو کہا"۔

"اچھا بھئی، اچھا" ڈیڈی بولے "بچھو اور ٹھواں ایک ہی بات ہے۔ اسے چھونا مت۔ اس کے ڈنک میں زہر ہوتا ہے"۔

"اِس کی آٹھ ٹانگیں ہیں" میں نے کہا "کیا یہ مکڑی کی کوئی قسم ہے؟"

ڈیڈی بولے "مکڑی کی قسم تو نہیں، البتّہ اُس کا رِشتے دار ضرور ہے"۔ اِتنے میں بچھّو نے اپنے پنجے ہِلائے، جیسے کسی چیز کو پکڑنا چاہتا ہو۔

"یہ تو کیکڑے کی طرح ہے" ریحان نے کہا۔

"کیکڑا کیا؟" شمیم آپا نے پُوچھا۔

"Crab" ڈیڈی نے بتایا "قدیم زمانے میں بچھّو اور کیکڑے ایک ہی خاندان کے جانور تھے۔ بچھّو دُنیا کا قدیم ترین جانور ہے اور 40 کروڑ سال سے زمین پر رہ رہا ہے۔ آپ کو یہ سُن کر تعجّب ہوگا کہ اِس عرصے میں دوسرے جانوروں میں کافی تبدیلی آئی ہے، لیکن بچھّو ویسا کا ویسا ہی ہے جیسا 40 کروڑ سال پہلے تھا۔ سائنس دان اِسے زندہ فاسل کہتے ہیں"۔

"یہ کھاتا کیا ہے؟" ریحان نے پُوچھا۔

"مکڑیاں اور کیڑے مکوڑے" ڈیڈی نے کہا "رات کو شکار کرتا ہے اور اُسے زندہ نِگل جاتا ہے۔ اگر کوئی شکار اِس کے پنجوں سے نکلنے کی کوشش کرے تو یہ اُس کے ڈنک مار دیتا ہے، جس سے وہ مرجاتا ہے اور پھر یہ اُسے کھا جاتا ہے"۔

"کیا اِس کے ڈنک سے آدمی بھی مر سکتا ہے؟" ریحان نے پُوچھا۔

ڈیڈی نے کہا "مرتا تو نہیں لیکن اُسے تکلیف بہت ہوتی ہے۔ بچپن میں ایک بچھّو نے میرے ڈنک مار دیا تھا۔ میں دو دِن مچھلی کی طرح تڑپا تھا۔ شمالی امریکا کے ایک مُلک 'میکسیکو' میں بہت خطرناک بچھّو پائے جاتے ہیں۔ اُن کے کاٹے سے اِنسان مرجاتا ہے"۔

"اگر بچھّو رات کو شکار کرتے ہیں تو کیا دن میں سوتے

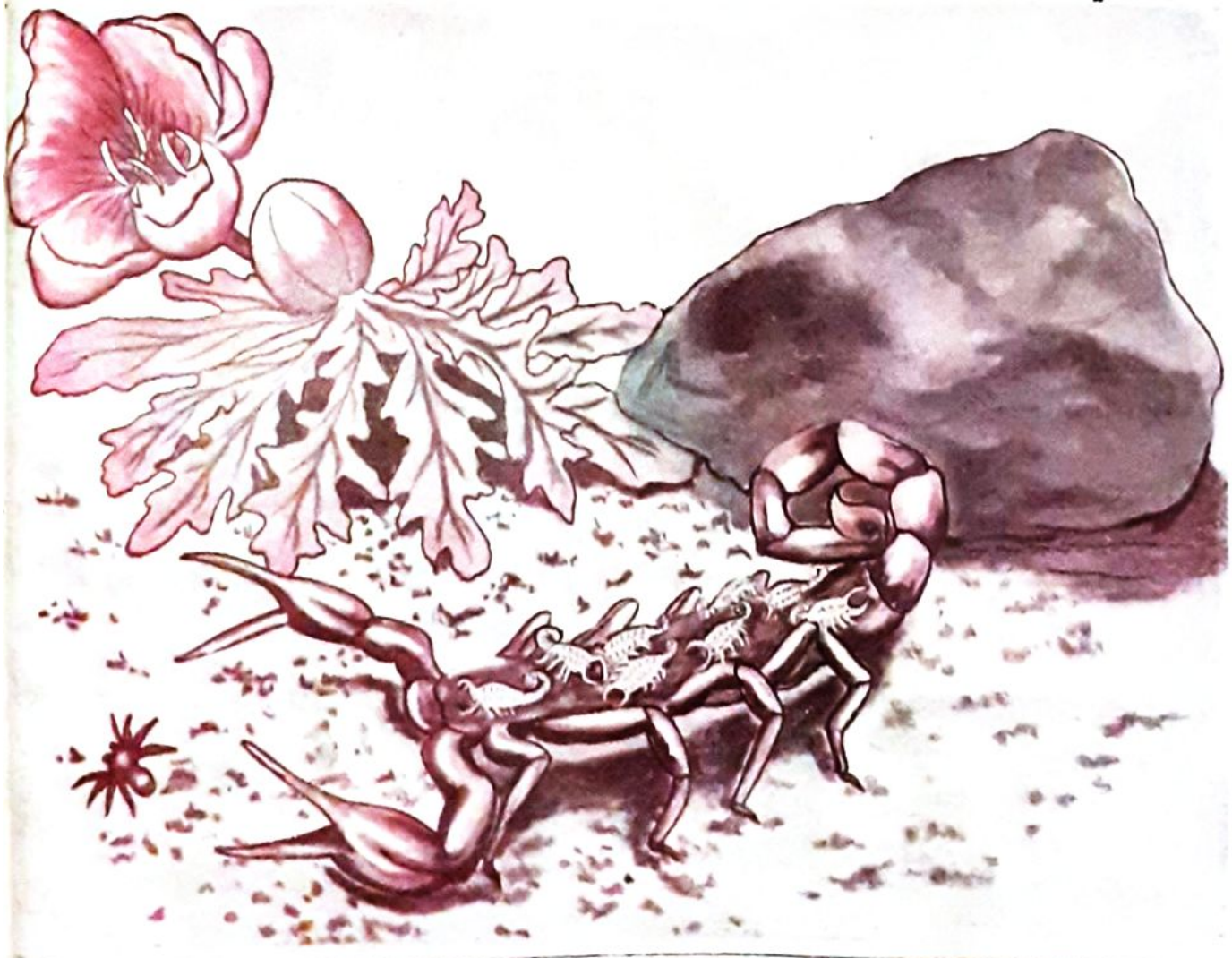

ہیں؟" میں نے پُوچھا۔

"ہاں' یہ دِن میں پتھّروں' اِینٹوں کے نیچے اور سُوراخوں کے اندر چھُپ کر سوئے رہتے ہیں اور رات کو باہر نکلتے ہیں۔ یہ زیادہ دُھوپ برداشت نہیں کر سکتے۔ اِنہیں سایہ چاہیئے۔ دُھوپ میں مرجاتے ہیں"۔

"بچھّو کی مادہ انڈے دیتی ہے؟" ریحان نے پُوچھا۔

"نہیں' بچّے دیتی ہے" ڈیڈی نے کہا "اور یہ بچّے جب تک خود چلنے پھرنے اور شکار کرنے کے قابل نہیں ہو جاتے' ماں کی پیٹھ پر چڑھے بیٹھے رہتے ہیں"۔

جب ڈیڈی ہمیں یہ باتیں بتا رہے تھے' میں بچّھو کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ تھوڑی دُور چلتا اور پھر رُک جاتا۔ پھر چلتا اور پھر رُک جاتا۔

"بچھّو کے دُشمن بھی تو ہوں گے؟" میں نے ڈیڈی سے پُوچھا۔

"ہاں۔ اِن کے بہُت سے دُشمن ہیں' مثلاً پرندے' چھپکلیاں' بندر۔ یہ جانور بچھّو بہُت شوق سے کھاتے ہیں--- اب سوال یہ ہے کہ ہم اِس کا کیا کریں؟"

"میں بتاتی ہُوں' کیا کریں" یہ امّی کی آواز تھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اُنہوں نے جُوتی اُتاری اور تڑاق سے بچھّو کے دے ماری۔ اُس کا کچُومر نکل گیا۔

ڈیڈی بولے "آپ نے خواہ مخواہ اِس بے چارے کو مار ڈالا"۔

امّی بولیں "یہ بے چارہ نہیں' بہُت مُوذی جانور ہے' اور مُوذی کو دیکھتے ہی ہلاک کر دینا چاہیئے"۔

"ہماری امّی بہُت بہادر ہیں" ریحان نے کہا۔

"آپ کی امّی خوش حال خان خٹک کے خاندان سے ہیں" ڈیڈی نے کہا۔

امّی ہنس کر بولیں "ہمارے ہاں پشاور کے علاقے میں بچھّو بہُت ہوتے ہیں۔ جب میں وہاں تھی تو روز دو تین بچھّو مارا کرتی تھی"۔

ہم تینوں بہن بھائی بچھّو کو' بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اُس کے کچُومر کو افسوس بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ ڈیڈی بولے "میں نے آپ کو بچھّو کے کتنے دُشمن بتائے تھے؟"

"تین: پرندے' چھپکلیاں اور بندر" میں نے بتایا۔

"اِن میں اِنسان کا اِضافہ بھی کر لیں" ڈیڈی نے کہا۔

آپ جانتے ہیں؟

☆ عربی زبان میں اُونٹ کے لیے تقریباً 100 مُختلف الفاظ اِستعمال ہوتے ہیں۔

☆ 72 سال کی عُمر تک ایک آدمی کا دِل 3,000 ملین (تین ارب) دفعہ دھڑک چُکا ہوتا ہے۔

☆ ہم ناک سے سُونگھتے ہیں۔ سانپ زبان سے سُونگھتے ہیں۔

☆ اصلی ہیرا ٹھنڈا ہوتا ہے۔ آپ اُسے چُھو کر بتا سکتے ہیں کہ وہ اصلی ہے یا نقلی۔

☆ انگریزی کے اِس جُملے میں انگلش کے تمام (26) حروف موجود ہیں:

The quick brown fox jumps over the lazy dog.

☆ آدمی کے ڈاڑھی کے بال اِتنی ہی موٹائی کے تانبے کے تاروں سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔

☆ اگر آپ 6 میل فی گھنٹے کی رفتار سے' بغیر رُکے' سیدھے بھاگتے چلے جائیں تو 173 دن میں پُوری دُنیا کا چکّر لگا سکتے ہیں۔

☆ دنیا میں 900 کے قریب چڑیا گھر ہیں۔ اِن میں' جانوروں کی تعداد کے لحاظ سے' سب سے بڑا سان ڈیگو کا چڑیا گھر ہے۔ (سان ڈیگو ریاست ہائے مُتحدہ امریکا کی ایک ریاست کیلی فورنیا کا دوسرا بڑا شہر ہے)۔ یہ چڑیا گھر 78 سال پُرانا ہے اور اس میں 800 قسم کے 3,800 جانور ہیں۔